

مَشْكَاتُ الْقُرْآنِ

— بِرِیاضِ —

قُرْآنِ مُطَالَعَةِ مِیسُورِیْنِ صِدِّیقِیْنِ

— (از) —

لَا نَعْبُدُ إِلَّاكَ يَا بَادِي

وَمُفْتِ قُرْآنِ

۳  
بیدالواحد اسلامیک و لیسریج فونڈ لیش

۱۹۔ ویسپی ہائی روڈ، مدراس ۳



# مَشْكَاتُ الْإِقْلَاقِ

— يَا —

قُرْآنِ مُطَالَعَةِ مَسْئُومِ صَدِيقِ مَن

— (از) —

مَوْلَا نَاعِبِدُ الْمَاجِدِ رَبِّ بَادِئِ

مَدِيرِ صَدَقِ جَدِيدِ وَمُفَسِّرِ قُرْآنِ

ناشران:

ٹی۔ عبد الواحد اسلامیک ریسرچ فونڈیشن

۱۹۔ ویسپی ہائی روڈ، مدراس ۷



# قُرْآنِ مُطَالَعَةِ بَیْسُوین صَدِی مَیں

حکیم عبدالقوی دریا بادی دکنہ نے اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن

مد اس کے لئے سرفراز پریس بکسٹو میں چھپوا کر شائع کیا

ملنے کے ہے

صداقِ جدید بک ایجنسی، کچہری روڈ، دکنہ

دالیش محل، اقلین الدولہ پارک، لکھنؤ

جلد اول، مارچ ۱۹۷۷ء قیمت پندرہ روپے



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

# پیش لفظ

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

پیش نظر مجموعہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے ان قرآنی خطبات پر مشتمل ہے جو انھوں نے شہر مدراس میں مدراس کے معزز و مخیر تاجر جناب الحاج ٹی عبدالواحد صاحب سابق ایم پی کی فرمائش و خواہش پر قلم بند کئے تھے اور نیوکالج مدراس کے وسیع ہال میں ۲۸ جولائی سنہ ۱۹۷۷ء سے یکم اگست سنہ ۱۹۷۷ء تک پڑھ کر سنائے گئے تھے، ان جلسوں کی صدارت کی خدمت ان بطور کے راقم کے سپرد ہوئی تھی، جس نے اس کو اپنی حیثیت سے واقف ہونے کے باوجود حاجی صاحب کے احترام، اور اپنی ایک بڑی سعادت سمجھ کر قبول کیا تھا، ان جلسوں میں مولانا کا نام سنکر نہ صرف شہر مدراس بلکہ بنگلور، میسور تک کے اہل ذوق علماء و فضلاء جدید دانش گاہوں کے اساتذہ و طلبہ اور مولانا کے عقیدت مند و نادیدہ مشتاق جمع ہو جاتے تھے شاید اس سے پہلے بہت عرصہ سے یہ وسیع ہال شائقین سے اس طرح نہ بھرا ہوگا جیسا کہ اس موقع پر وہ بھرا نظر آتا تھا، یہ سب خطبات نہایت ذوق و شوق اور سکون و خاموشی کے ساتھ سنے گئے، راقم بطور نے اپنی پہلی تقریر میں یہ کہا کہ عن قریب وہ زمانہ آنے والا ہے جب لوگ اس پر فخر کریں گے کہ ہم نے مولانا عبد الماجد دریابادی کو دیکھا، اور ان کی زبان سے کچھ سنا تھا، کہنے والے کو بھی اس کا احساس نہ تھا کہ یہ زمانہ اتنی جلد آجائیگا، یہ عقیدت مند علم جو نطلہ لکھنے کا عادی تھا اسکو رحمۃ اللہ علیہ اور مرحوم و مغفور لکھنا پڑے گا، اس کا بھی قلق ہے کہ یہ کتاب بعض حوادث اور مجبور یوں کی بنا پر ان



کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی، اب یہ مقدمہ کی چند سطریں اس وقت لکھی جا رہی ہیں، جب ان کی ذفات پر پورا ایک مہینہ بھی نہیں گزرا ہے۔

جس کتاب آسمانی کے متعلق "شہان علینا بیانہ" اور "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" کی پیشین گوئیاں خود اسی کتاب میں موجود ہیں، اس کے لئے یہ انتظام خداوندی بالکل قرین قیاس اور قطعاً لائق تعجب نہیں ہیں کہ اسکے اعجاز و صداقت کو ثابت کرنے کے لئے ہر دور میں غیبی اور تقدیری انتظامات کئے جاتے رہیں، علوم و فنون، فکر انسانی کی ترقیاں، نئے نئے اکتشافات و معلومات جو نئے سوالات پیدا کرتے ہیں، اس کتاب ایمان رکھنے والے، اور اس سے عشق و محبت کرنے والے، اور اس کے لیے زندگیاں وقف کر دینے والے علماء ان سوالات کے جواب دینے کا بیڑا اٹھائیں، اپنے علم و مطالعہ، تدبر فی القرآن، جدید علوم سے واقفیت، اور اپنی محنت سے قرآن مجید کے اعجاز و صداقت کو بے نقاب کریں، اس کے ابدی اصولوں اور بدلتی ہوئی زندگی کے درمیان علم کی ماری سائی، عقل کی کوتاہی اور فکر و نظر کی سطحیت سے جو موہوم حجابات اور خیالی خلیج پڑ جاتی ہے اس کو دور کریں اور ہر زمانہ میں اسکو ایک "زندہ جاوید" کتاب ثابت کریں، جب ساری دنیا کو اس کے لفظی اعجاز، اور اسکی مادراء، انسان بلاغت کی طرف توجہ تھی، اور اس کی صداقت کا یہی معیار سمجھا جاتا تھا، تو باقلانی، رمانی اور جرجانی نے "اعجاز القرآن" اور "دلائل الاعجاز" کے نام سے کتابیں لکھیں، اور خدا نے زحمت کشی، اور بیضادی جیسے نکتہ شناس اور مذکور پیدا کئے، جب علوم عقلیہ اور فلسفہ یونان کے سحر و افسون سے سارا عالم اسلام مسموم و مسحور نظر آنے لگا، تو خدا نے امام فخر الدین رازی جیسا مفسر پیدا کیا، جس نے ان عقلی و فلسفی اعتراضات کا جواب دیا جو ان علوم کے سطحی النظر مقلد قرآن مجید کے غیبی حقائق اور مادراء عقل علوم و مضامین پر وارد کرتے تھے، ان کی تفسیر نے (جس کے ساتھ بہت سے ناقدین نے نا انصافی سے کام لیا ہے) اس مرغوبیت اور احساس کہتری کو دور کرنے میں بڑی



مفید خدمت انجام دی جس کے بہت سے وہ لوگ شکار ہو گئے تھے جن کی ایک عمر ان عقلی  
 علوم کے مطالعہ میں گزری تھی، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے کتنے  
 لوگوں کے ایمان بچ گئے، اور کتنے لوگوں کے ایمان میں نئی طاقت و توانائی پیدا ہو گئی۔  
 اب یہ نیا دور تھا، عقلی علوم اور فلسفہ یونان کے بجائے، تجربی علوم، سائنس،  
 بالخصوص طبیعیات کا دور دورہ تھا، ہر شعبہ میں نئے نئے اکتشافات و تحقیقات ہو رہی تھیں،  
 تاریخ و جغرافیہ کے علم نے وہ اہمیت اختیار کر لی تھی، جو انھیں کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی،  
 تمدن، علم المعیشت، اقتصادیات اور قانون نے غیر معمولی وسعت اور مقبولیت حاصل  
 کر لی تھی، بہت سے قدیم تاریخی مسلمات اور جغرافیائی ڈالٹ محل نظر، بلکہ خلاف واقعہ سمجھی  
 جانے لگی تھیں، نئی کھدائیوں اور آثار قدیمہ کی دریافت نے نئی نئی حقیقتوں کی  
 نقاب کشائی کی تھی، اس سب سے عالم اسلام بالخصوص اس کے علمی طبقہ پر ایک  
 نئی ذمہ داری عاید ہوتی تھی، اب ان جدید معلومات و تحقیقات کی روشنی میں اعجاز قرآن  
 اور صداقت قرآنی کو اسی طرح عیاں اور عالم آشکارا کرنا تھا، جیسا کہ قدیم علماء متکلمین  
 اور مفسرین قرآن کو اپنے زمانہ میں یونانی فلسفہ اور حکمت اور الحاد و باطنیت کا مقابلہ کرنا  
 پڑا تھا، اور انھوں نے علمی و عقلی دلائل سے قرآن مجید کی حقانیت کو ثابت کیا تھا۔  
 اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے لیے کم سے کم ہمارے ملک میں مولانا عبدالماجد  
 دریا بادی رحمۃ اللہ علیہ نے کمر ہمت باندھی، اور انگریزی اور اردو میں اپنے تفسیری  
 نوٹس کے ذریعہ اس خدمت کو انجام دیا، اس کام کی تکمیل کے لیے ہمارے علم میں وہ  
 موزوں ترین آدمی تھے، اس لیے کہ وہ جدید علوم میں بصیرت رکھتے تھے، ان کو مطالعہ  
 کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا، ان کی نظر میں غیر معمولی وسعت اور ثقافت میں تنوع تھا،  
 وہ جدید طبقہ کی نفسیات اور ذہنی ساخت سے واقف تھے، علم کے نیز رفتاروں  
 و ادان قافلہ سے وہ کبھی بچھڑنے نہیں پائے، اور اس تفسیری خدمت کے دوران



میں تو انھوں نے خاص طور پر اس کا اہتمام رکھا کہ کوئی ایسی کتاب ان کی نظر و مطالعہ سے بچنے نہ پائے جس سے قرآن مجید کے بیانات کی تصدیق میں کچھ بھی مدد ملتی ہو یا لہا سال کی اس کوشش و مطالعہ اور عرق ریزی کا نتیجہ ان کی انگریزی اور اردو کی تفسیر ہے، اور یہ مضامین اس کے خاص انتخابات اور شریکات پر مشتمل ہیں جو انھوں نے مدرس میں اپنے خطبات کے موقع پر پیش کیے، امید ہے کہ قرآن مجید کے مطالعہ کرنے والوں اور اہل ذوق کے لئے معلومات افزا اور بصیرت افروز ثابت ہوں گے اللہ تعالیٰ اس کتاب کو بھی مولانا کی علمی خدمات اور دینی حسنات میں شامل فرمائے اور ناظرین کو زیادہ سے زیادہ نفع ہو۔

ابوالحسن علی ہندوی

فروری ۱۹۷۲ء





## پیش لفظ

نَحْمَدُكَ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِكَ الْكَرِيمِ وَعَلَى آلِهِ وَأَزْوَاجِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ

۱۱-۱۲ سال قبل جنوری ۱۹۵۷ء میں آپ کے اس شہر میں اول بار حاضری ہوئی تھی اور آپ حضرات کے اخلاص کی برکت سے ایک نئی چیز ”سیرت نبوی قرآن مجید سے“ وجود میں آگئی تھی، ابھی پھر آپ حضرات کے لطف و کرم نے کھینچا اور اگرچہ وہ خلاق مجسم ہستی آپ کے درمیان اب موجود نہیں جس کا نام فضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کر نولی تھا، پھر بھی اس خادم سے انکار و اعراض نہ بن پڑا اور بصارت کی روز افزوں معذوری کے باوجود حاکم ہو جانا ہی پڑا۔

اب کے موضوع ”مشکلات القرآن“ اور دوسرا عنوان اسی پہلے عنوان کی شرح و توضیح ”قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں“ اور مقصد یہ ہے کہ آج کے طالب علم کے ذہن میں قرآن مجید کے مطالعہ کے دوران میں جہاں جہاں کچھ کھٹک پیدا ہوتی ہے اسے اپنے امکان بھر رفع کر دیا جاتا رہے اور اس کا ایمان اس پر بے غبار قائم رہے۔ یہ کوشش ایسے شخص کی طرف سے ہو رہی ہے جو علم سے بے بہرہ اور عمل سے بالکل ہی کور ہے۔ پھر بھی ایک عمر سے نادت قرآن سے لگے لیٹے پڑے رہنے کی ہو گئی ہے اور اسی لئے کچھ تھوڑی بہت کثود کار تو قرآن کے نازل کرنے



والے کے فضل بکراں سے ہو ہی گئی ہے۔ جس کا یہ کلام ہے وہ اگر چاہے تو جاہل سے جاہل کے لئے بھی پتھر کو پانی بنادے۔

ظاہر ہے ان معروضات میں کوئی شے بالکل نئی نہ مل سکے گی وہی چیزیں ملیں گی جنہیں اپنی اردو تفسیر قرآن کے پہلے ایڈیشن میں عرض کر چکا ہوں اور وہ اب زیر طبع دوسرے ایڈیشن میں مزید وضاحت کے ساتھ پیش ہو رہی ہیں، سامعین باتکمن کے لطف و کرم سے توقع ہے کہ وہ اس تکرار کو بھی بے مزہ اور خالی از نفع نہ پائیں گے۔

قرآن کی خدمت صدیوں سے ہوتی چلی آئی ہے اور بے شمار شرحیں اور تفسیریں اب تک لغوی اور نحوی، ادبی اور فلسفیانہ، فقہی اور کلامی، معنوی اور منقوی پہلوؤں سے لکھی جا چکی ہیں۔ اضافے کی ضرورت پھر بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گی۔ اللہ کے کلام کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کر لینا کس بندے کے بس کی بات ہے؟ امام فخر الدین رازی کی وفات ۶۰۶ھ ہجری میں ہوئی ہے اور ان کی کرامت کے لئے یہ کافی ہے کہ انہوں نے سارے متعلقہ علوم غصری کو قرآن کے خادم کی حیثیت سے اپنی تفسیر میں لا کھڑا کیا ہے۔

وہ ساتویں صدی ہجری کا آغاز تھا اور اب چودھویں صدی کا اختتام ہے حکمت الہی سے بعید کیا ہے کہ ان کے کسی کفش بردار کو مزید توفیق دے دے کہ انہیں کے دکھائے ہوئے راستے پر پڑانے علوم کو نئے سے بدل دے۔

بہر حال ایک خام کار سے جو کچھ بن پڑا آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے اللہ انہیں حسن قبول عطا فرمائے اور اب آپ کی اجازت سے وہ معروضات پیش ہوتے ہیں۔

عبدالمجاہد

اگست ۱۹۷۰ء



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## پہلا خطبہ

— (۱) —

سورۃ البقرہ چوتھے رکوع کے شروع میں آیت نمبر ۳ آتی ہے

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً  
قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَ  
یَنۡحَنُ نُسَبَیۡمٌ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ  
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

”اور وہ وقت بھی یاد کے قابل ہے جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے  
کہا کہ میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں، وہ بولے کیا تو اس میں ایسے کو  
بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا، حالانکہ ہم تیری حمد کی  
تسبیح کرتے رہتے اور تیری پاکی پکارتے رہتے ہیں، اللہ نے فرمایا یقیناً میں  
وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“

ظاہر ہے کہ جس وقت کا یہ مکالمہ ہے اللہ کی جناب میں ایک نوری مخلوق فرشتہ کے  
نام سے آباد تھی، اور یہ زمین بھی موجود تھی۔ اور اب اس میں ایک نئی مخلوق آباد ہونے جارہی  
تھی، جس کا کام زمین پر احکام قانونی و شرعی کا نافذ کرنا ہوگا، اور ذی شعور مخلوق کے درمیان  
نظم و انتظام کرنا، ورنہ قانون تکوینی و طبی کے انصرام کے لئے تو فرشتے موجود ہی تھے، اور یہ  
کارخانہ حیات ان کے ذریعہ اور واسطہ سے بہر حال چل رہی رہا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ کسی بالکل



جاءت مع لفظ الاستفهام ولكن معناه الايجاب (عجاز القرآن)  
 ”ہمزہ گو لفظ استفہامی ہے لیکن معنا کلام ایجاب کا دیتا ہے۔“



اور اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کلام میں کوئی پہلو طنز یا اعتراض کا نہیں، بلکہ یہی ہے تمام تر دُورِ عبودیت اور فراطنیازِ بندگی پر اور مراد ہے اس کے کہ آخر ہم غلامانِ بارگاہِ کس دن، اور کس خدمت کے لئے ہیں؟ جو ارشاد ہونا ہے ہم ہی سے ہو، نہ کہ اس نئی مخلوق سے جو اپنی سرشت اور طبیعت کے لحاظ سے یقیناً کرائی طبع کا باعث ہو گی؟ مفسرِ جلیل حافظ ابن کثیر کے ہاں ہے:

ليس على وجه الاعتراض على الله وعلى وجه الحسد

لبني آدم كما يتوهمه بعض المفسرين

”اس میں نہ کوئی اعتراض ہے اللہ تعالیٰ پر اور نہ حسد ہے بنی آدم پر، جیسا کہ کبھی کسی مفسر کو وہم ہو گیا ہے۔“

اور اس سے ملتی ہوئی عبارت قاضی بیضاوی کی بھی ہے

وليس اعتراض على الله تعالى ولا طعن في بني آدم

على وجه الغيبة فانهم اعلى من ان يظن بهم ذلك

اور سب سے بڑے کر تشفی بخش اس سلسلہ میں وہ تحریر ہے جو ہمارے شیخ وقت مفسر جھانویؒ نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں فرمائی ہے، ملاحظہ ہو :-

”مطلب یہ ہے کہ ہم سب کے سب آپ کے فرماں بردار ہیں، اور ان میں

کوئی مفسد و مفاک بھی ہو گا۔ اگر یہ کام ہمارے سپرد کیا جائے تو ہم سب لوگ

لگ پٹ کر اس کو انجام دے لیں گے۔ یہ سب لوگ اس کام کے نہ ہوں گے

ان میں سے جو مطیع ہوں گے وہ تو جان و دل سے اس میں لگ جائیں گے،

مگر جو مفسد و ظالم ہوں گے ان سے کیا امید ہے کہ اس کام کو انجام دیں

غلاصہ یہ کہ جب کام کرنے والوں کا ایک گروہ موجود ہے تو ایک نئی مخلوق کو جن

میں کوئی کوئی کام کا اہل نہ ہو گا۔ اس خدمت کے لئے تجویز فرمانے کی کیا ضرورت ہے؟“



(ختم ہوئی منسّر تھانوی کی بات)

حکایت کا حکمانہ خاتمہ فرشتوں کے اس اعتراض پر ہوتا ہے کہ بیشک طرح طرح کی مخلوقات کی ضرورتوں کا، اور پھر ہر ایک کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا پورا علم بھی تو تجھ ہی کو ہو سکتا ہے۔ ہمارے تھوڑے سے اور محدود علم کو نسبت ہی تیرے غیر محدود اور بے پایاں علم سے کیا ہو سکتی ہے۔ حکمتوں اور مصلحتوں سے بھرپور بے شک تیرا ہی ہر حکم اور ہر فیصلہ ہو سکتا ہے۔ قرآنیات کے طالب علم کو شروع میں ایک دشواری یہ پیش آتی، لیکن قرآن ہی کی برکت سے بحمد اللہ حل بھی ہو گئی۔

## بخیر ۲

اسی طرح دوسرے رکوع کا شروع حکم توحید سے ہوتا ہے، اور اس کے مابعد کی آیت میں بیان ایجاز و اجمال کے ساتھ خلقت کائنات کا ہے:

الَّذِي يَجْعَلْ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً يُهَوِّدُ  
أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا  
لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

”وہ وہی پروردگار ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا اور آسمان کو چھت اور اس نے اتارا آسمان سے پانی۔ اور پھر (اس نے) اٹھائے لئے غذا کو پھل پیدا کر دیا۔ سو تم اللہ کا (کوئی) ہمسر نہ ٹھہرانا۔ اور تم جانتے

(نوجہتے) بھی ہو۔“

یہاں زمین و آسمان کی نہایت کا بیان ہو رہا ہے، نہ ان کی ماہیت ارضیاتی و فلکیاتی کہ ان علمی اور فنی یا سائنسی پہلوؤں سے یہاں مطلق بحث نہیں۔ قرآن نے یہاں دونوں کا ایک ایک وصف امتیازی چُن لیا۔ اور ان ہی کے بیان پر اکتفا کر لی۔ زمین کا وصف تو یہ



بیان کیا کہ وہ انسان کے لئے بمنزلہ فرش ہے۔ وہ گول ہو تو، اور چوکھنٹی ہو تو، ہر صورت میں انسان کے پیروں کے نیچے ہے انسان اس پر چاہے چلے پھرے بیٹھے لیٹے کھڑے باسوئے ہر حال میں یا اس کے نیچے فرش کا کام دے گی اس پر جو سولہوی بھی اس کا جی چاہے چلائے، گھوڑے اور خچر، اور بیل اور اونٹ اور سائیکل اور ریل اور موٹر۔ ہر حال میں وہ اسے سنبھالے رہے گی اور اس کا بوجھ اٹھائے رہے گی۔ انسانی ضرورتوں کے لئے پٹھوس اور ہموار اور سطح ہے، نہ کھردری، نہ پللی، نہ کھوکھلی نہ بچکچی، کہ بیٹھ جائے یا دھنس جائے۔ یا اپنے اندر نگل لے۔

اسی طرح السماء کا وصف خصوصی اس کی بلندی کو چن لیا اور الارض کی پستی یا فرشیّت کے مقابل اس کی بلندی یا رفعت کو بیان کر دیا۔ کہ وہ تو انسان کے لئے بمنزلہ چھت کے ہے۔ اس کے ٹھوس اور خول ہونے سے یہاں مطلق بحث نہیں۔ بحث صرف اس سے ہے کہ وہ سب سے بلند چیز ہے۔ چھت کی طرح نسل انسانی کو ہر طرف سے ڈھانپے ہوئے۔ انسان جتنا بھی چاہے اچھلے کودے جس بلند سے بلند پہاڑ کی چوٹی پر چاہے چڑھتا چائے ہو یا میں جتنی بھی اڑان دکھائے، خلا میں زیادہ سے زیادہ قلابازیاں کھاتا رہے۔ بہر حال آسمان کے نیچے ہی رہے گا۔ کسی صورت میں اس سے باہر نکل کر نہ جاسکے گا۔

تیسری بات آیت میں یہ بیان کر دی کہ انزل من السماء ماء کہ آسمان سے پانی اسی پروردگار نے اتارا ہے۔ یہ معنی اس کے ہرگز نہیں کہ چھت کے اوپر، پانی کا لا محدود ذخیرہ کوہ قارست نیکیوں کے اندر محفوظ ہے۔ اور اللہ ان کی ٹونیاں جب چاہے کھول کر زمین پر پانی برسا دیتا ہے۔ یہ بھی اللہ کیلئے بالکل آسان ہوتا۔ سوال امکان کا نہیں، واقعہ کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سائنس کی کتابوں نے جو لمبا اور سلسلہ دار طریقہ بیان کیا ہے یعنی سمندر کے پانی کا گرمی پا کر بھاپ کی شکل میں تبدیل ہونا، اس کا بادل کی شکل



اختیار کر کے اوپر اٹھنا، ہواؤں کے سہارے فلاں اور فلاں سمت میں منھل ہونا، اور فلاں درجہ کی حرارت پاکہ پانی کی بندیں یا قطرے بن جانا، پھر فلاں مقدار میں نازل ہونا وغیرہ۔ اس ساری داستان مفصل و مطول کا خلاصہ و ماحصل دو لفظوں میں بیان کر دینا قرآن ہی کا اعجاز ہے، اس کو درمیانی واسطوں اور سلسلہ اسباب سے کوئی بحث نہیں۔ یہ کام تو مادی مشاہدوں اور تجربوں سے لینا تو عقل کے سپرد کر دیا گیا ہے، اور علوم طبعی کے حوالہ قرآن مجید نے تو صرف اتنا بتا دیا کہ پانی برسانا کام اللہ ہی کا ہے، نہ کہ کسی اور کا، جس طرح اس نے زمین کی فرشیت اور آسمان کی بلندی کی تخلیق کو اپنی جانب منسوب مخصوص کر لیا تھا۔

چوتھی بات آیت میں یہ بتائی کہ فَاَخْرِجْ مِنْهُ مِنَ الشَّجَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ اس نے پانی کے ذریعہ تمہارے لئے غذا کو پھل اُگا دیے۔

الشَّجَرَاتِ کے تحت میں غلے، ترکاری، ساگ پات اور پھل پھلاری، سب ہی زمین سے اُگنے والی غذا ہیں آگئیں۔ سائنس کے کسی بیان سے قرآن کا کہیں ٹکراؤ نہیں۔ قرآن نے تو بس اتنا بتا دیا کہ کائنات میں جو کچھ اور جس طرح بھی ہو رہا ہے، جو کچھ بھی تمہاری آنکھیں دیکھتیں اور تمہارے حواس محسوس کرتے ہیں، ساری کاریگری اور صنعت اور تخلیق دونوں عالم کے پروردگار ہی کی ہے۔ اور آیت کا توڑ اس پکار پر کیا ہے کہ:-

فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اٰنْذَادًا وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

”اللہ کا ہمسر کسی کو بھی نہ ٹھراؤ (نہ کسی انسان یا جن یا فرشتہ کو، نہ کسی چرند پرند حیوان کو، نہ کسی دریا یا پہاڑ کو، نہ کسی سائنسی فارمولے یا طبعی قانون قاعدہ کی کسی دفعہ کو) اور تم جانتے بوجھتے بھی ہو۔“

یعنی اتنی نوئی حقیقیں تو عام فہم ہیں۔ انسانی فہم پر روشن و واضح۔ یہ کوئی دقیق و غامض



علمی نکتے اور عقلی اسرار و رموز نہیں۔

آفرینش کائنات و اجزاء کائنات سے متعلق قرآن کا عام انداز بیان یہی ہے کہ وہ اسباب و جزئیات اسباب کی طرف نہیں جاتا بلکہ سارا زور خالق و مخلوق کے ربط و تعلق پر دیتا ہوتا ہے، اور گھوم پھر کر ذہن انسانی کو اس نقطہ پر لاتا ہے کہ ایک خالق کل ناظم کل، حاکم کل، قادر کل کو مان لینا آسان تر اور زیادہ قرین عقل ہے، یا ہزار ہا ہزار وسائط کے جنجال میں پڑے رہنا؟

### —: پتہ ۳: —

قرآنیات کے طالب علم کو ایک اور دھچکا اس وقت پہنچتا ہے، جب وہ سورہ بقرہ کے چھٹے رکوع کے شروع میں اس آیت پر پہنچتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓئِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيْ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْنٰكُمْ  
وَ اِنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلٰى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (آیت ۴۷)

”اے بنی اسرائیل میرا وہ انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کیا۔ میں نے تمہیں دنیا و جان والوں پر فضیلت دی۔“

اور اسی مفہوم کی اور آیتیں بھی آگے چل کر قرآن مجید میں ملتی ہیں۔ بنی اسرائیل کو عام طور پر مراد سے یہود کے سمجھا گیا ہے اور جس انعام کو یاد دلایا گیا ہے اس انعام سے مراد دنیوی انعام، ملک و مال، دولت و شوکت سمجھا گیا ہے۔ یہ مفہوم لے کر اب تادم سخن کے اوراق سے سوال ہوتا ہے کہ یہ بے مثل و بے نظیر اقبال اس کے کس دور میں اور عالم کے کس خطہ میں یعنی کب اور کہاں حاصل رہا ہے؟ یہود کی نفس اقبال مندی میں شبہ ذرا نہیں۔ بڑے سے بڑے ملک و سلطان اس قوم میں ہوئے ہیں۔ بڑے سے بڑے ساہوکار اور سرمایہ دار اس میں گزرے ہیں۔ سوال اس کا نہیں، سوال اس قوم کے سب سے بڑے چڑھ کر ہونے کی باہت ہے۔



کیا ایسے با اقبال افراد اس قوم میں ہوئے ہیں ؟ دوسری ترقی یافتہ قوموں میں نہیں ہوئے ہیں ؟ سوال اس قوم کے بے نظیر ہونے کی بابت ہے۔ قرآن نے جو صراحت کے ساتھ انھیں افضل ترین اقوام عالم کہہ دیا ہے تو ثبوت بیسویں صدی عیسوی کا طالب علم قرآن کے اس دعوے کا مانگتا ہے، اور نشان دہی متعین ملک و زمانہ کی چاہتا ہے۔

جواب سے پہلے دو تاریخی حقیقتیں ذہن نشین کر لیجئے اور جواب بالکل سہل ہو کر سامنے خود بخود آجائے گا۔

پہلی بات یہ کہ بنی اسرائیل کوئی مذہبی اصطلاح نہیں، یہ ایک نسلی نام ہے۔ اس قوم کا لقب، جو یعقوب معروف بہ اسرائیل بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کی نسل سے پیدا ہوئی۔ اور اپنے وطن شام سے نکل کر پھر اطراف عالم میں پھیلی۔ ظہور اسلام اور بعثت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں نبوت رسالت جہاں کہیں بھی تھی نسلی و قومی ہی تھی۔ آفاقی اور تمام تر اعتقادی تو دنیا میں پہلی بار ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے ہوئی ہے۔ خاندان یعقوب کی اصل فضیلت یہ تھی کہ جہاں اسے عزت و حکومت سے نوازا گیا، وہیں اس کے اندر انبیاء بھی پیدا ہوئے اور اسے شرف رسالت سے بھی مشرف کیا گیا۔ وَجَعَلْنَا فِيكُمْ رُسُلًا (مائدہ آیت ۲۰) اس معنی پر دال ہے۔

دوسری بات یہ کہ دنیوی سروری اور سرداری، ملک گیری اور ملک داری کے انعام

میں، ایران و ہند، عراق و چین، یونان و مصر کے بہت سے افراد شریک و شریک ہیں لیکن شرک و مخلوق پرستی کی آلائش سے ان میں سے کوئی بھی قوم محفوظ و مستثنیٰ نہ رہی۔ آفتاب پرستی، ماہتاب پرستی، انجم پرستی، مورتی پوجا وغیرہ ہر ملک میں ایک ضمیمہ علوم و فنون تہذیب و دانش کی کاسبنے رہے اور دیوتا، اوتار، بلکہ انگریزی اصطلاح میں ہیرو گارڈ (Hero God) کا عقیدہ تقریباً ہر مذہب یا دھرم کا جزو و لا ینفک رہا کیا ہے۔



اور تاریخ کے دور میں صرف ایک ہی قوم عقیدہ توحید کی علم بردار رہی، اور خالص پرستی کی تلقین کرتی رہی۔

قرآن نے جس انعام خصوصی کا ذکر اس قوم کے سلسلہ میں بار بار کیا ہے اور اس میں اس کا شریک و ہم کسی دوسری قوم کو نہیں گردانا ہے، وہ یہی نعمت توحید ہے، اور بار بار اس امتیاز خصوصی کا ذکر کر کے اس ناشکر گزار قوم کو بتایا ہے کہ صدیوں تک اس نعمت خاص کی بارش تمہارے اوپر ہوتی رہی، تم ہی کو اس دعوت کا نقیب، پشتہا پشت تک رکھا گیا ہے۔ اور اب بالآخر اتمام حجت کے بعد تمہارے سلسلہ کفران کی پاداش میں یہ نعمت تمہارے خاندان و نسل سے سلب کی جاتی ہے۔ اور دین توحید آج سے بجائے نسلی یا قومی مذہب کے، ایک اسماعیلی پیغمبر واسطے سر دین انسانی یا عمومی کیا جاتا ہے۔ ہر نسل و قوم کے لئے جو بھی صحیح عقیدہ کا اتباع کرے اور توحید و رسالت کا قائل ہو جائے۔ اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ کے اس صحیح مفہوم پر جس کسی کی نظر پہنچ جائے گی، اس کا بجائے کسی شک و اشتباہ کے، قرآن کی تاریخت پر ایمان کس قدر مستحکم تر ہو جائے گا!

ہمارے جو مفسرین یہود اور بنی اسرائیل کو مراد سمجھے ان کے ہاں ایک سوال امت موسوی اور امت محمدی کے درمیان تفاضل کا پیدا ہو گیا ہے، حالانکہ دونوں کے مفہوم کا فرق اگر واضح رہے، تو سرے سے تقابل و تفاضل کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ امت محمدی ظاہر ہے کہ نام کسی نسل یا قوم کا نہیں بلکہ وہ تو ایک خاص عقیدہ کے ماننے والوں کا نام ہے، خواہ وہ کہیں کے باشندے ہوں اور کوئی سا بھی نسب رکھتے ہوں۔

—: (۴) —: —

اسی رکوع میں ذرا آگے چل کر آیت پچاس میں بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے



یہ الفاظ ملتے ہیں :

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَجْبَيْنَكُمْ وَاعْرِقْنَا آتَا  
فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ⑤

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تمہارے لئے سمندر بچاڑ دیا، پھر ہم نے تم کو بچا لیا اور فرعون و اوروں کو غرق کر دیا تھا، اس حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے۔

سوالی آج کے قاری کے دل میں قدر ثناء پیدا ہوتا ہے کہ واقعہ کہاں کا ہے ؟ اور کب کا ہے ؟ ہمارے بھولے بھالے مفسرین جو جغرافیہ کے مبادی سے بھی واقف نہیں تھے اور ان کے کانوں میں نام صرف دریائے نیل کا پڑا ہوا تھا، قدر ثناء ہی سمجھے کہ وہ دریا دریائے نیل ہی ہوگا۔ یہ قیاس تمام تر ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ بنی اسرائیل جس شہر میں آباد تھے، اس کا نام تو دیت میں جشن (GOSCHAN) آیا ہے۔ اسرائیلیوں کو یہاں سے شام کی طرف آنا تھا، جو اس شہر سے شمال و شرق میں واقع تھا۔ نیل پر ان کے جا چہنچنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی، سو اس کے کہ راستہ اس وقت بالکل ہی اٹکا اختیار کیا ہو، شام و فلسطین تو شمال مشرق میں تھے۔ بنی اسرائیل اسی سمت چلے، لیکن بجائے اس کے کہ شمال میں ابھی کچھ اور چلے جاتے پہلے ہی مشرق کو مڑ گئے، اور جنوب میں بحر قزقم کی اس شاخ سے ٹد بھیر ہو گئی، جو آپک دو شاخہ کی صورت میں کوئی دو میل کے عرض میں سمندر کے بائیں طرف واقع ہے، اور جسے موجودہ نقشہ میں خلیج سویز کہتے ہیں۔

بعض مغربی روایتوں میں یہ آیا ہے کہ یہ ہجرت اسرائیل تمام تر ایک ہی مرتبہ نہیں ہوئی بلکہ مختلف چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ہجرت کرتی رہتی تھیں۔ یہ روایتیں اگر کبھی پایہ ثبوت کو پہنچ جائیں تو اس وقت اس پر روشنی قرآن مجید کے لفظ فَجَعَلْنَا سے پڑے گی جو باب تفصیل سے ہے، اور جس کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ فعل کا بت رتج ہونا دکھاتا ہے اس خروج یا ہجرت کے وقت راستوں پر لمپ، لالٹین وغیرہ کی روشنی کہاں تھی،



بلکہ آج کل کی سیدھی ہموار سچتہ سرکاری بھی موجود نہ تھیں اور یہ عجبت اور گھبراہٹ اس پر  
مستزاد کہ راتی راتا ہی حدود مصر کو پار کر لیں۔ شب کی تاریکی میں اگر اسرائیل راہ بھولی گئے  
ہوں تو تعجب اس پر ذرا نہ کیجئے۔ فرعون کو خبر ہو گئی اور وہ خود اپنی کمان میں لشکر جہاز کے  
تغائب کو چڑھ دوڑا۔ زمانہ کا تعین جزم کے ساتھ مشکل ہی ہے تاہم اکثر محققین کا رجحان یہ ہے کہ  
قبل مسیح کے وسط کی جانب ہے بلکہ بعض مثلاً سرچارلس مارشمن نے تو جرات کر کے مسند  
بھی نشین کر دیا۔ سلسلہ قبل مسیح۔

### — (۵) پتہ: —

تاریخ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں قرآن مجید مذکورہ تو بہت سے واقعات کا کریا  
ہے کہیں صراحتاً اور کہیں اشارتاً، لیکن کم سے کم ایک واقعہ ایسا ہے جس کے لئے ذہن میں  
ضرور گزیر پیدا ہوتی ہے، ارشاد ہورہا ہے بنی اسرائیل ہی سے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْرِ فَقُلْنَا  
لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝ (آیت ۶۵)

”تم خوب جانتے ہو ان لوگوں کو اپنے میں سے جنہوں نے سبوت کے بائے

میں حدود سے تجاوز کیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ۔“

عَلِمْتُمْ کے معنی خود ہی یہ ہیں کہ مخاطبین کے سامنے ان کے کسی جانے  
بوجھے واقعہ کا ذکر ہورہا ہے اور اس پر کہ حرف سرتا کید اور قد حرف  
تاکید کا مزید اضافہ۔ گویا تاریخ اسرائیل کا کوئی خوبہ ہی معروف و متعارف واقعہ  
جس سے موجود الوقت اسرائیل کو مجال انکار نہیں۔ سبوت یا ہفتہ کا دن ان کے ہاں  
بہت محترم تھا اور احترام سبوت کے احکام ان کے ہاں نہایت درجہ تاکید تھے۔  
ذکر لا محالہ کسی ایسے واقعہ کا ہورہا ہے جو سبوت شکنی کرنے والوں اور احکام سبوت کی بھرتی



کرنے والوں پر بطور سزا کے نازل ہوا تھا، اور پھر مدتوں ان کی قوم میں یہ بطور عادت و  
 معتادت زبان زد عام رہا۔ کریم یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایسا اہم واقعہ کب اور کہاں پیش آیا  
 مجاہد کوئی معمولی اور متاخر شخص نہیں، تابعی ہوئے ہیں۔ اور تابعی بھی ایک متاخر درجہ  
 رکھنے والے۔ ترجمان القرآن۔ ان سے یہ قول ابن جریر وغیرہ میں منقول چلا آیا ہے کہ  
 انسانوں کا یہ نسخہ عورتوں اور حبائیں ہوا بلکہ محض سیرت و کردار و عادات و خصائل کے لحاظ  
 سے وہ ذیل بندر بنائے گئے جیسا کہ قرآن ہی میں سورۃ الحجج میں یہودیوں کو گدھے  
 سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کَمَثَلِ الْإِصْحَارِ۔ اور راغب کے مفردات القرآن میں بھی  
 ایک قول اسی معنی میں نقل ہوا ہے۔ اس مفہوم کو تسلیم کر کے قدرتا و قدر کا  
 استبعاد از خود رفع ہو جاتا ہے اور ذہن کو کوئی خاص حیرانی نہیں رہ جاتی۔ پھر بھی کب اور  
 کہاں کے سوال کسی درجہ میں تو باقی ہی رہ جاتے ہیں۔

ان دونوں سوالوں کا جواب ثقہ اور سنجیدہ اسلامی روایتوں میں ملتا ہے کہ واقعہ  
 حضرت داؤدؑ کے زمانہ کا ہے اور آپ کا زمانہ جدید تحقیق کے مطابق ۱۰۱۳ ق م  
 سے لے کر ۹۷۳ ق م تک رہا ہے اور مقام کا نام جس کا پتہ قرآن نے حَاضِرَةُ الْجَزْ  
 کہ کہ سورۃ الاعراف میں دے دیا ہے یعنی ساحل سمندر پر ایلہ آپا ہے۔ تو زمین میں  
 اس کا نام ایلات (Elath) صحیفہ (استثناء باب دوم آیت ۸) اور موجودہ  
 جغرافیہ میں اس کا نام خلیج عقبہ کا مشہور بندر گاہ عقبہ ہے۔

### ————— ﴿۲۶﴾ —————

ایک بڑے اچھے میں سلمان کو ڈالنے والا مقام قرآن میں وہ ہے جہاں حضرت  
 سلیمانؑ کی صفائی کفر سے پیش کی گئی ہے اور ارشاد ہوا ہے کہ:

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا (رکوع ۱۳، آیت ۱۰)



”سیمان نے تو کبھی کفر نہیں کیا، البتہ شیطان کفر کرتے تھے۔“

سیمان کو قدرِ ثناء یہ پڑھ کر کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ سیمان جب سب پر حق تھے تو یہ کہنے والی کون سی بات تھی کہ آپ کفر کے مرتکب نہیں ہوئے۔ کفر کر کے کوئی مومن ہی کب باقی رہ سکتا ہے۔ چہ جائیکہ پھر اس کا ارتکاب کر سکے! دل کی کھٹک بجا ہے اور اس وقت تک باقی رہے گی، جب تک یہ نہ سُن لیا جائے کہ درودِ بڑے اور صاحبِ کُفّٰی مذہبوں نے آپ کو اپنی کتاب میں نعوذ باللہ دینِ توحید سے مرید اور بے دین قرار دیا ہے۔ غورِ عتیق کے صحیفہ ۱۔ سلاطین کی عبارت ملاحظہ ہو:-

”جب سیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوڑیوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی

طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا (بابِ آیت ۲۱۴)

اور اسی صحیفہ کی دوین آیتیں اور بھی:-

”سو از بسکہ اس کا دل خداوند کی طرف سے برگشتہ ہوا، اس لئے خداوند

سیمان پر غضب ناک ہوا، کہ اس نے حکم و باتھا کہ وہ جہنمی معبودوں کی پیروی

کرے، پھر اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا۔“ (سلاطین: ۱۱، ۱۰۹)

یہ اور بات ہے کہ محققین جدید کی تحقیقات بھی بائبل سے کہیں زیادہ قرآن کی تائید

میں آ رہی ہیں اور ان کے اصل حوالے خاکسار کی تفسیر میں دُج ہو چکے ہیں۔

غرض قرآن مجید نے یہ بھی بتا دیا کہ ساحرانہ اور کافرانہ حرکتیں آپ کے عہد میں

نوشیا طین جن و انس ہی کرتے تھے، اور انھیں منسوب آپ کی جانب کر دینے تھے قرآن

مجید میں یہاں لفظ شیا طین صیغہ جمع آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد ابلیس تو نہیں

سکتا۔ لا محالہ شیطان مجازی ہی مراد ہوں گے۔ یعنی شیطان صفت انسان یا جنات، جو طرح

طرح کی شیطانی حرکتیں کرتے رہتے اور ملک میں فتنہ و فساد پھیلانے رہتے تھے

۔ سحر و کھانٹ، ٹونے ٹونکوں، نقش و گندڑوں کا زور جو یہود کے ہاں رہا ہے اس



اُن کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ قرآن مجید اس کی تصدیق یوں کرتا ہے :  
يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ : لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے۔ اور اس  
 سے معاً پیشتر ہے :

وَالَّذِينَ الشَّيْطَانُ كَفَرُوا (کفر تو شیطان کرتے تھے) اس کا کھلا  
 ہوا مطلب یہ ہے کہ کفر تو شیطان کرتے تھے اور وہی لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے۔ لیکن  
 ایک دوسری ترکیب یہ بھی جائز سمجھی گئی ہے کہ فاعل بجائے شیطان کے یہود کو قرار دیا جائے  
 یعنی اس فقرہ قرآنی کو جو ذرا پہلے آچکا ہے، فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ آوَوْا إِلَى الْكِتَابِ کو  
 عملاً نتیجہ اس صورت میں بھی دہی نکلتا ہے، یعنی عہد سلیمانی کے شیطان صفت یہود سحر آری  
 اور سحر کے چہرے میں مشغول تھے۔

ان تصریحات کے معاً بعد قرآن مجید میں ہے :-  
وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِ هَارُوتَ وَمَارُوتَ (۱۲۶، ۱۲۷)  
 ”اور وہ نیچے لگے اس (علم) کے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و  
 ماروت پر اُتار دیا گیا تھا۔“

بابل جس ملک کا نام ہے اس کو اب عراق عرب کہتے ہیں اور اسی کا ایک قدیم نام  
 کلدانہ یا کلدانیہ بھی ہے۔ اس کی شہرت علوم سحریہ میں اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ انگریز  
 میں کالڈین مرادف ہی ساحر کا ہو گیا ہے، اور دو فرشتوں کے عطف کے یہ لازم نہیں آتا کہ  
 سحر فلسطینی اور سحر بابلی کا عروج ایک ہی زمانہ میں رہا ہو بلکہ بیان و سابق قرآنی میں صاف  
 گنجائش اس کی موجود ہے کہ دونوں ملکوں کے عروج سحر کا زمانہ الگ الگ ہو لیکن یہود کی  
 ہمارے سحر دونوں قسم کے سحر میں مشترک رہی ہے۔

اور وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ میں لفظ أُنْزِلَ سے کسی کو دھوکا  
 نہ ہو کہ بشرط تعظیم کا لفظ سحر کی سی حرام چیز کے لئے لایا گیا۔ ”نزل“ و ”انزال“



عربی میں موقعِ شرف و تعظیم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تکوینی حیثیت سے جو شے بھی اللہ کے ہاں سے اور فرشتوں کے واسطے سے آتی ہے، سب پر اطلاق عام اس سے کہ وہ خیر ہو یا شر، نازل و انزال کا ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ فعل رزق (دروزی) کے ساتھ آیا ہے، اور ماء (پانی) کے ساتھ، اور انعام (چوپایوں) کے ساتھ، اور رب کے ساتھ کہ درجز (عذاب یا بلا) کے ساتھ بھی۔ سورہ عنکبوت کی آیت ۳۳ میں اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰی اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ اور ایک سحر ہی پر کیا موقوف ہے، کائنات میں نور و ظلمت، خیر و شر، حق و باطل، طاعت و معصیت میں سے جو کچھ بھی موجود ہے سب کا وجود تکوینی حیثیت کے سبب الاسباب ہی کے نازل کرنے سے تو ہوتا ہے۔ اور سحر کے لئے یہاں انزال اپنے اسی وسیع معنی میں آیا ہے۔ یعنی یہ بات ان کے دل میں ڈال دی گئی، کوئی اظہارِ شرف و تکریم مقصود نہیں یہی طرح کوئی حیرت فرشتوں کے ذکر پر بھی نہ کیجئے، ایک سحر کیا معنی، کفر و شرک، کوئی گندہ سے گندہ کام بھی تکوینیات کے سلسلہ میں ہوا آخر فرشتوں ہی کے واسطے یا وسیلہ سے تو لیا جاتا ہے اور یہ امر فرشتوں کی برگزیدگی و معصومیت کے ذرا بھی منافی نہیں۔

بابل والوں کے سحر پر علاوہ تاریخی شہادتوں کے گواہی خود عہدِ عتیق کی موجود ہے چنانچہ صحیفہ دانیال (باب ۴، آیت ۳) اور صحیفہ مکاشفہ (باب ۱۰، آیت ۵) اور باب ۱۰، آیت ۳۰ وغیرہ میں صراحتیں درج ہیں۔ اور ایک جگہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلدانیوں کی فرد جرم کا سر عنوان یہی جرم سحر کا ہی تھا۔ صحیفہ مکاشفہ میں ہے:

”تیرے سوداگر زمین کے امیر تھے، تیری جادوگری سے ساری قومیں

مگراہ ہو گئیں اور نبیوں اور مقدسوں اور زمین کے سب عقولوں کا خون اس میں

بہایا گیا۔“ (باب ۱۰، آیت ۲۳، ۲۴)

قرآن مجید میں یہ سارا تذکرہ اس تاریخی اسرائیل کے ضمن میں لایا گیا ہے اور گویا یہود و عرب پر



حجت قائم ہو رہی ہے کہ سحر و کھانت کی پلیدی سے تو لہر ہوئے ہو اور تاریخ کا کوئی سا دور ہو، یا زمین کا کوئی سا قطعہ ہو، فلسطین ہو یا بابل، تمھارے ہاتھ تو برابر اس جرم سے رنگین رہے ہیں۔

مَلَكَيْنِ (بالفتح) کی ایک قرأت اگرچہ مَلَكَيْنِ بھی ہے کسرہ لازم کے ساتھ اور اس بنا پر اہل تفسیر کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ یہ دونوں اصلاً فرشتے نہ تھے بلکہ بشر تھے اور بادشاہ۔ اور انھیں جو دوسری روایتوں میں فرشتہ کہا گیا ہے تو صفاتی حیثیت سے۔ یعنی ان ملکوتی صفات کی بنا پر۔ لیکن جمہور کا قول اس قرأت مشہور کی بنا پر ان کے فرشتے ہی ہونے کا ہے۔ اور کسی خاص تشریحی مصلحت کے کسی خاص موقع پر اور کبھی امر و نہی ہی کی تفتیح و تحقیق کی غرض سے کسی فرشتہ کو انسانوں کے درمیان رہنے سہنے کے لئے بشری جذبات و خصائل سے موصوف کر کے بھیج دیا گیا تو اس سے کوئی بھی قباحت لازم نہیں آتی۔ خصوصاً جب کہ مقصود ہی سحر و کھانت کا ابطال و استیصال ہو۔ آخر دیوی حکومتوں میں تو روزمرہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مجرموں کی سرشاہی اور گرفتاری میں، اور جرائم کے قلع و قمع کی خاطر پولیس کانسٹیبلوں ہی کو تیس، پچاس، ستر بڑے بڑے سرکاری افسروں کو بھی کیسے کیسے طریقہ مجرموں ہی کے سیکھنے پڑاتے ہیں اور خود کیسے کیسے مصنوعی اور نقلی جرائم کا ارتکاب کرنا ہوتا ہے۔ بات رد کفر سلیمان سے شروع ہوئی تھی اور پھر بات میں بات نکلتی آئی، یہاں تک کہ بہت سی اُجھنیں ایک ہی سلسلہ کی صاف ہو گئیں۔

————— ﴿﴾ —————

اسی قصہ سلیمانی کے ضمن میں اور گویا محض اتفاقہ اور لپیٹ میں، قرآن، اسرائیلیوں کی ایک اور بھی خصوصیت بیان کر گیا ہے اور وہ بھی سننے کے لائق ہے۔ یہ فرشتے سحر کے گر کسی کو بلا ضرورت بتاتے ہی نہ تھے، اور جب ضرورت مایمان کرتے



بھی تو یہ ضرور تنبیہ کر دیتے کہ ہم تو امتحان کے لئے بھیجے گئے ہیں، تم کہیں واقعہ اور عقیدہ  
سحر کو نہ اختیار کر لینا، ورنہ اس طرح کا فرہو جاؤ گے۔

وَمَا يُعَلِّمَنَّ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا غَنِّ فَتْنَةً فَلَا  
تَكْفُرُ (رکوع ۱۳، آیت ۱۰۲)

”اور وہ دونوں کسی کو بھی فن کی باتیں نہ بتاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے  
کہ ہم لوگ تو بس ایک ذریعہ امتحان ہیں تو کہیں تم کفر نہ اختیار کر بیٹھنا۔

”تعلیم“ یہاں باقاعدہ درس دینے کے مفہوم میں نہیں، محض اطلاع یعنی جلد سے  
پہچاننے، بتانے کے معنی میں (جیسا کہ صاحب معالم التزئیل و صاحب بحر المحيط وغیرہ نے  
کہا ہے) خود ایک قرآنی قرأت تواتر میں بھی تحفیف لام کے ساتھ و مصدر اعلام سے  
آئی ہے۔

لیکن اس شدید و صریح انتباہی ہدایت کے باوجود بھی ایک خاص قسم کے نقش او  
گندے یعنی میان بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے والے یہ لوگ ضرور ان سے بیکھ لیتے۔  
ارشاد ہوتا ہے :-

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ  
وَزَوْجِهِ (رکوع ۱۳، آیت ۱۰۲)

”گر لوگ ان سے سحر سیکھ لیتے جس سے وہ جدائی ڈال دیتے درمیان مرد  
اور اس کی زوجہ کے۔“

قرآن مجید کو آخر اس مخصوص نوعیت کے جھاڑ پھونک کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟  
اس کے جواب میں عرب کے ایک امی کے لائے ہوئے کلام کو نہیں، بلکہ یہ دیکھئے  
کہ بیسویں صدی کے آغاز کے علماء یہود اور محققین اسرائیل اپنے اسلاف و اجداد کے مشغلہ سحر  
و ساحری اور اعمال سفلیہ سے متعلق کیا کہتے ہیں، بلکہ شش ہوش سہاعت فرمائیے :-







اور غلامگیر پیدا کی جا رہی ہے، اس میں مرکزیت اور یکتہ جہتی کی خاطر کوئی قبلہ نہ بنادیا جائے گا۔ وہ ذاتِ لا محدود بے پایاں تو خود ہی ہر طرف ہر مکان کو اپنے اندر لئے ہوئے گھیرے ہوئے ہے۔ اس کی سمائی بھلا کس طرف و مکان میں ہو سکتی ہے؟ ہاں! وہ لامکان اور ماوراءالظہر اپنی عکسوں اور مصلحتوں کے لحاظ سے اس موحد اُمت کے لئے دعا و عبادت کی غرض سے جو بھی قبلہ، جو بھی نقطہ مرکزیت چاہے مقرر کر دے۔ اس میں دخل کسی سمت کی ذاتی قدوسیت کو ذرا بھی نہیں۔

زمین استقبالی کعبہ کے لئے قرآن نے اس آیت میں تیار کر دی۔ کعبہ رخی اور مائیں متعلقہ معروضات آگے سنئے گا۔

### ————— ﴿۹﴾ —————

معا بعد جو آیت آتی ہے اس میں ذکرِ سیھی شرکِ عیسٰی مسیح کی فرزندگی رب کا ہے۔ الفاظ یہ ہیں :-

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۚ سُبْحٰنَهُ ۚ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ  
وَالْاَرْضِ ۚ كُلٌّ لَّهٗ قَانِیُّوْنَ ۝ (آیت ۱۱۴، رکوع ۱۴)

اور نصراہنوں نے کہا کہ اللہ نے ایک بیٹا بنالیا ہے۔ پاک ہے وہ! اصل یہ ہے کہ اس کی ایک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اُسی کے فرمانبردار ہیں۔ یہ کسی صریح حماقت ہے کہ اللہ سے اس کی کسی بھی مخلوق کا رشتہ انبیت یا نبیت کا قائم کیا جائے۔ سب اس کی مشیتِ تقدیری و تکوینی کے آگے جھکے ہوئے ہیں رایت میں جو لفظ اتَّخَذَ اللہ وَلَدًا ہے، اس کا ترجمہ ہے اللہ نے اپنا بیٹا بنالیا ہے۔ اس کے بیٹا ہے نہیں، بلکہ بیٹا بنالیا ہے یا عوامی محاورہ میں ”گود لئے لیا ہے“ عرب کے ایک امی کے نواسے اور چلائے ہوئے لفظ خیال میں رکھئے، اور پھر ایک سرسری نظر مسیحی فضلیں ہی



کی مرتب کی ہوئی "تاریخ مسیحیت پر گریجیو"۔ دوسری صدی عیسوی میں ایک بڑا فرقہ ان میں  
 تھا ہے ADOPTIONISTS اتحادیہین کے نام سے۔ اس کا مرکزی عقیدہ  
 یہ نہیں کہ مسیح خدا کا جنا ہوا، پیدائشی بیٹا ہے، بلکہ گویا خدا نے کامل و مکمل انسان کو اپنا بیٹا بنی  
 کر لیا ہے۔ اور اسی عقیدہ کی شرح یہ ہے کہ مسیح نہ خلق خدا ہیں نہ وہ شروع سے بنے بنائے  
 تھے ترشائے خدا پیدا ہوئے۔ وہ اسلاف بشر ہی تھے۔ البتہ اقنوم ثالث یعنی روح القدس کا  
 فیضان ان پر شروع سے پڑنے لگا اور ان سے وہ قدیمیت کے ایسے عروج کمال پر پہنچ  
 گئے کہ اقنوم اول، خدا نے برتر و اعظم نے انھیں اپنی اہمیت میں لے لیا اور شریک الہیت  
 کر لیا۔ اور اب وہ ربوبیت، مالکیت وغیرہ سب صفات الہی میں شریک و ہم ہیں۔ آٹھویں  
 صدی عیسوی میں پاپائے روم نے اس عقیدہ کو اتحاد و زندہ قرار دیا۔ اور بارہویں صدی  
 عیسوی میں اس فرقہ نے پھر زور پکڑا۔ ہمارے سلطان مفسرین اور خادمان قرآن سے  
 اگر کہیں کوئی چوک مطالعہ مسیحیت کے دقائق میں رہ گئی ہو تو اس میں ان بچاؤں کا کیا قصور؟  
 آخر وہ قرآن کی ہمہ دانی، ہمہ گیری کہاں سے لاتے؟

### ————— بینہ ۱۰ —————

تاریخ بنی اسرائیل کے اہم عنوانات گنا کر سولہویں رکوع کے شروع میں پھر وہی مضمون  
 دہرایا ہے، جو اسی تاریخ کے سلسلہ میں پچھٹے رکوع میں ارشاد ہوا تھا۔  
 يٰبَنِي إِسْرَآئِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ  
 وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ (آیت ۱۱۷، رکوع ۱۵)  
 اسے بنی اسرائیل یاد کرو میری نعمتیں جو میں نے تمہیں بخشی تھیں اور یہ کہ میں نے  
 تمہیں دنیا بہان والوں پر فضیلت دی تھی۔  
 گویا یہاں خاتمہ پر دو باتوں کی طرٹ اشار کر دیا۔



ایک یہ کہ جب تک نسلی و قومی بنوتوں اور درساالتوں کا دستور قائم رہا، سب برگزیدہ اور مقبول قوم اسرائیل ہی کی رہی۔ کسی دوسری قوم کو بحیثیت قوم موقتہ ہونے کا شرف حاصل نہ تھا۔

دوسری بات یہ کہ خدائی امر بانی کوئی ایسی شے نہیں ہوتی، کہ کسی قوم پر بہر حال و بہر صورت چکی ہو، یہ شرط ہوتی ہے۔ بندہ جب تک اس ادارے کو شکر کرتے رہتے ہیں، نعمتیں اور انعام اُن پر قائم رہتے ہیں، لیکن جب اس کے بگاڑنے، شکری اور نافرمانی مسلسل ہونے لگتی ہے اور اپنے ہی پیغمبروں سے کشتی و غارت و سرسبز زمرہ جاتی ہے، تو بالآخر وہ نعمتیں سلب بھی ہو جاتی ہیں اور وہ انعام پائے ہوئے اب محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ گہری اور مستقل حقیقتیں ہیں ہر موقع پر کام آنے والی۔

### ————— ختم —————

اس کے بعد ذکر حضرت سربراہ ابراہیم کا شروع ہوتا ہے اور اس ذکر کے بعد لکچر کا امتحان بعض چیزوں میں لیا گیا اور آپ جب خدائی امتحان میں پورے اُترے تو آپ کو انعام یہ ملا کہ دنیا کی امامت آپ کے سپرد کی گئی۔

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۝ (مکہ ۱۵ - آیت ۱۵)

آشرف نے فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں؟

اور امامت سے مراد اصطلاح قرآنی میں، سلطنت و حکومت، جادو و مال نہیں بلکہ دینی و روحانی پیشوائی ہے۔ اور قومیت میں بھی یہ وعدہ انعام اتنی ڈھرایا گیا ہے کہ قرآن کا جامع و بالغ لفظ "امام" اُس میں مودی نہیں۔ صحیفہ پیدائش میں سب سے پہلے:

"اور میں تجھ کو ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا

کروں گا، اور تو ایک برکت ہوگا، اور ان کو جو تجھے برکت دینا برگت دوں گا،



اور ان کو جو تجھ پر لعنت کرتے ہیں لعنتی کر دوں گا، اور دنیا کے سارے گھرانے

تجھ سے برکت پائیں گے۔" (باب ۱۲، آیت ۱-۲)

یہ وہی امامت ہے جو آج تک ابراہیم کے حصہ میں چلی آ رہی ہے، اور اسلام کے علاوہ بھی جو مذہب توحید سے کچھ بھی لگاؤ رکھتے ہیں، یعنی یہودیت اور نصرانیت، وہ آپ کی امامت مسلم رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک نامور فرنگی فاضل آپ کا تعارف ان سائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بیسویں صدی عیسوی کے ثلث کے خانہ پر یوں کرتا ہے:

"ابراہیم کی ہستی کسی یہودی سرور کی نہ تھی، جو لٹ مار کرتے یا ملک گیری

کرتے رہتے۔ ان کی اصل اہمیت مذہب کے دائرہ میں ہے۔ وہ حقیقتاً مورتی

کسی نسل کے نہیں بلکہ بانی و امام مذہبی تحریک کے تھے۔ محمد کی طرح جو ان کے

دو ہزار سال بعد پیدا ہوئے۔ وہ ساری قوموں اور قبیلوں کے رہنما کی حیثیت

اور قوریت کے حسب روایت اسرائیلی مذہب کے بانی تھے" (طبع چہارم، جلد اول صفحہ ۲)

جن لفظوں کو میں نے اس مجلس میں زور دے کر پڑھا ہے، انہیں ایک بار پھر سن لیجئے:

محمد کی طرح وہ بھی قوموں اور قبیلوں کے رہنما تھے۔ اللہ کے خلیل اور اللہ کے حبیب کے درمیان یہ مماثلت کا اعتراف، یورپ کی زبان سے بے لوث شہرہ کی شان ہے!

ابراہیم خلیل باوجود مرتبہ خلعت، بہر حال انسانی دل و جگر اور بشری جذبات رکھنے

تھے۔ یہ مزہ و غنیمت، بارش بارش ہو گئے، اور فرما سرت سے وہ جھٹ سے بول اٹھے

وَمِنْ ذُرِّيَّتِي؟ اور میری نسل بھی اس امامت میں حصہ وال ہو گی نہ؟ دُریت کے

معنی اولاد ہی نہیں بلکہ اولاد و اولاد بھی۔ گویا اس میں آپ کا سارا سلسلہ نسل آگیا، شاخ

اسرائیلی، شاخ ایشیائی دونوں کو شامل۔ اور قرآن نے اسرائیلیوں کے اس دعویٰ کی جڑ ہی

کاٹ دی کہ ابراہیم سے جو وعدے ہوئے، وہ انہیں کی شاخ اسرائیلی کے ساتھ مخصوص

محدود تھے!



ضمناً روشنی اس پر بھی پڑ گئی کہ وعدہ انعام و نعمت میں اپنی اولاد کو شریک کر لینے کی  
نفاذ صرف اطمینان سے ہے، بلکہ سنتِ انبیاء بھی!

بہر حال آپ کی دعا کا جواب، قرآن کے مبلغِ ربحاً میں یہ ملا کہ:

لَا يَنْتَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۝ (آیت ۲۴) "میرا وعدہ مافرازون کو نہیں پہنچتا۔"

یعنی فضل و برکت کا سلسلہ تمہاری نسل میں ضرور جاری رہے گا، لیکن اس کے تحقق کے لئے  
محض ارثِ نسل و نسب کافی نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح کا بھی ضروری ہیں۔

الظَّالِمِينَ کے لفظ کا خوب خیال رکھیے، کافر تو اس میں کھلے ہوئے داخل ہیں  
لیکن اہل علم کے ایک گروہ نے اس سے مراد فاسق بھی لئے ہیں۔ اور شدتِ تھانویؒ نے اس  
سے یہ بہتباظ تو بہت ہی خوب کیا ہے کہ "اختیاری بدی کے ساتھ فضلِ خداوندی اور انعامِ الہی  
جمع نہیں ہو سکتے۔"

یہ تاثر بھی عجیب ہے کہ بائبل کی تاریخی غلطیوں کی کثرت سے انکار بعض روشن خیال  
فرنگیوں نے انیسویں صدی کے آخر میں حضرت ابراہیمؑ کی تاریخیت ہی سے انکار کر دیا اور یہ  
کہنے لگے کہ یہ شخصی نام نہیں بلکہ اکرم جنس تھا، یعنی شیخ قبیلہ کا لقب۔ لیکن کچھ ہی دن بعد پھر  
تحقیق کا رخ بدلا اور بیسویں صدی کا ٹلٹ اول ہی ختم ہو رہا تھا کہ ایک بار پھر ابراہیم خلیلؑ  
کی تاریخی حیثیت مسلم ہو گئی

————— ﴿ ۱۲ ﴾ —————

آیت ۱۱۵، ابھی کچھ ہی دیر پہلے گزر چکی ہے، **لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ**۔  
اب تحویلِ قبلہ کا حکم جب صراحت سے نازل ہونے کو ہے، تو پھر اس طرح کی چہ میگوئیوں  
اہل کتاب، خصوصاً یہود میں شروع ہوئیں، حالانکہ اب تک جو نماز کا قبلہ بیت المقدس بنا ہوا  
تھا یہ بنی کسی قرآنی حکم پر نہ تھا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء بنی اسرائیل کا قبلہ



اپنا بھی شخص اجتہاد بنا لیا تھا، اور اب قیام مکہ ختم ہونے اور ہجرت مدینہ اختیار کرنے پر کچھ زمانہ کے بعد قبلہ نصی قرآنی سے مقرر ہونے کو تھا کہ اس پر قبلہ و قال شروع ہو گئی اور قرآن کے بیان سے معلوم ہوا کہ زبانیں کس طرح چلنا شروع ہوئیں :-

سَيَقُولُ الشُّرَكَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا أَتَاهُمْ عَنْ قِبَلِهِمْ لَاقِي  
كَانُوا عَلَيْهِمْ قُلُوبُ اللَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي  
مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (دکھو ۱۰۰ آیت ۱۴۲)

یہ بے وقوف لوگ ضرور کہیں گے کہ کس چیز نے ان (مسلمانوں) کو ان کے اس  
قبلہ سے ہٹا دیا ہے جس پر وہ اب تک تھے۔ آپ کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب  
دونوں اللہ ہی کی ملک ہیں اور وہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ پر لے

کھدھتے اور ناہم لوگ پھر وہی قبیضہ سمت کا نکالی رہے ہیں، اور بحث مشرق اور مغرب  
کی شروع کر رہے ہیں۔ حالانکہ کسی سمت سے اور نہ پُرانے قبلہ سے کیا ہوتا ہے حکیم مطلق  
جن مصلحتوں اور حکمتوں سے بھی چاہے جس مکان کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے  
وہی سیدھی راہ کا اتباع ہوگا، اس کے کام میں چون و چرا تو وہی لوگ کریں گے جو سفید ہوں  
جو غفل کے گورے، فہم کے ناقص۔ افسوس ہے کہ مفسرین خود سمت و جہت کی بحث میں پڑ گئے  
قرآن نے اصل اعتراض ہی پر تو اعتراض کیا تھا اور اس پر بحث ہی کو سرے سے باطل ٹھہرایا تھا۔

————— ﴿۱۳﴾ —————

اور معا بعد جو حکم نماز کے وقت رخ کرنے کا ملتا ہے وہ کسی جہت یا سمت کی  
جانب نہیں بلکہ ایک مخصوص مکان اور متعین عمارت کی بابت لگتا ہے۔

قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (آیت ۱۴۲)

آپ اپنا منہ پھیر لیا کیجئے مسجد حرام کی طرف۔



اور معلوم و معروف ہے کہ مسجد الحرام نام ہے مسجد حرم شریف یا خانہ کعبہ مکی مسجد کا ایک معروف متعین علامات کا۔ اور قرآن نے یہ حکم صادر کر کے یہ بھی بتا دیا کہ یہ منکرین اہل کتاب اس حکم تحویل قبلہ کی طرف سے کسی اشتباہ و مغالطہ میں نہ رہیں اور انھیں بتا دیا گیا تھا کہ قبلہ براہ راست اس سمت کا بھی قبلہ ہوگا۔

وَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لِيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ (آیت ۱۲۳)  
”اور یہ لوگ کتاب پائے ہیں وہ یقیناً اسے بھی خوب جانتے ہیں کہ یہ حکم بھی ان کے

پرمرد و گارہی کی طرف سے ہے۔“

اور یہ لوگ ایک اسی حکم کو کیا ہمارے ان رسول کو بھی خوب ہی پہچانتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے خود اپنی قوم والوں کو خوب پہچانتے ہیں۔

الَّذِينَ اتَّخَذْتُمْ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَكُمْ كَمَا يَعْرِفُونَ آبَاءَهُمْ (آیت ۱۲۴)  
اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دے رکھی ہے وہ ان کو ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنے نسل والوں کو۔

يعْرِفُونَ میں ضمیر کا سے کیا مراد ہے؟ اگرچہ انگوں میں اکثر نے اس سے مراد ہی حکم تحویل قبلہ لیا ہے یعنی اہل کتاب مسجد حرام کو بھی بہ حیثیت قبلۃ الانبیاء کے خوب جانتے ہیں، لیکن بعد کو اکثر اہل تفسیر کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ اشارہ ذات رسول صلی علیہ وسلم کی جانب ہے اور انھیں خود کی اتنی علامتیں ان کے ہاں منقول ہیں کہ اب انھیں اس بار سے میں کوئی اشتباہ نہیں رہ سکتا، اہم ترین لفظ آیت میں آبَاءَهُمْ لفظی معنی اپنے لڑکوں کے ہیں لیکن آبَاءَهُمْ صیغہ جمع سے مراد فرداً فرداً نہیں، بلکہ قوم اسرائیل، نسل اسرائیل ہے اور یہ لوگ آپ کو بھی اسی طرح پہچانتے ہیں جیسے کہ اسرائیلی پیروں کو۔

تخصیب کو کام میں لائیں تو بات دوسری ہے



—: (۱۲) :—

در بیان کی بہت سی آیتوں کو طے کرتی ہوئی، آخری نظر اس آیت پر جا کر رکتی ہے،  
بلکہ رُک جاتی ہے۔ پوری آیت ذرا بڑی ہے۔ فرض مقصود کے لئے نصف آیت بالکل  
کافی ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وُجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَ  
الْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ  
وَأَسْلَمَ نَفْسَهُ وَالْكَثْبِ وَالنَّبِيِّينَ ۚ وَآتَى الْمَالَ عَلَى  
حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ  
وَالسَّائِلِينَ ۚ وَفِي الرِّقَابِ ۚ (آیت ۱۷۷)

”طااعت یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر دو بلکہ طااعت یہ ہے  
کہ کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر اور فرشتوں پر اور کتاب  
(انہی) اور پیغمبروں پر اور اس کی محبت میں مال تقسیم کرے قریب اور دُور  
اور یتیموں پر اور سائلوں پر اور راہ گیروں پر۔“

آیت قرآن مجید کی مشکل ترین آیتوں میں سے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں اصلاً بیان  
صرف دو چیزوں کا ہے، ایک اس کا کہ پر یا طااعت یا نہی کیا نہیں، اور ایک اس کا کہ پر  
یا طااعت یا نہی کیا ہے۔ اس دہرے سوال کا جواب بہت لمبا ہے۔ فلاں فلاں عقیدے  
اور مسالہاں اعمال طااعت کے ضروری اجزاء ہیں۔ طااعت کے جو ضروری اجزاء ہیں ان میں  
اختلاف کسی کو نہیں۔ اللہ، قیامت، انبیاء وغیرہ پر اعتقاد ہونا چاہیے۔ مالی امداد غریبوں،  
یتیموں، یتیموں وغیرہ سب کی کرنا چاہیے۔ گفتگو صرف اس میں رہ جاتی ہے کہ قرآن نے  
یہاں طااعت کے دائرہ سے باہر کس غل کو رکھا ہے؟ یہاں کس غل کا نام لے کر قرآن نے  
اس کے طااعت ہونے سے سرے سے انکار کیا ہے؟ وہ ہے مشرق یا مغرب کی



طرف رخ کرنا۔ اور مشرق رُخی یا مغرب رُخی کسی قسم کی بھی طاعت یا عبادت نہیں۔ اس استقبال قبلہ میں بھی چونکہ کسی نہ کسی طرف رخ کرنا ہی پڑتا ہے، اس لیے مفسرین کو اُلجھن یہ پیش آگئی ہے کہ اس سے تو استقبال کا حکم ہی رد ہوا جاتا ہے۔ حالانکہ آیت کے بیت الکعبہ کی طرف رخ کرنے کی ممانعت کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نماز میں تو رخ ایک متعین و معروف مکان۔ بیت الکعبہ کی طرف رہے، اور اب وہ مکان دنیا کے کسی خطے جس سمت میں بھی اور جب رخ پر بھی پڑ جائے۔ حکم میں سمت کی دوسرے سے تعین ہی نہیں۔ نہ جنوب کی، نہ شمال کی، نہ مشرق کی، نہ مغرب کی۔ اب اتفاق سے چونکہ وہ عمارت نمازی کے کسی نہ کسی سمت میں لا محالہ پڑے گی، اس لئے سمت کا تصور خود اس حکم کے ساتھ وابستہ ہو گیا اور اس نے قلب مومن میں اُلجھن پیدا کر دی۔ اہل میں حکم کی زد شرک قوموں پر پڑتی ہے جن کے ان شرک کی بیسیوں قسموں، آفتاب پرستی، ستارہ پرستی، بت پرستی وغیرہ کے ساتھ ایک خاص قسم مہمت پرستی کی تھی، اور کچھ شرک قومیں طلوع آفتاب کی بنا پر مغرب سمت مشرق کو سمجھنے لگیں تھیں۔ اور کچھ قومیں غروب آفتاب کی مناسبت سے سمت مغرب کو! قرآن کو یہاں مخالفت و ممانعت محض اس جہت پرستی یا سمت پرستی کی کرنا تھی! آیت اس خطبہ میں اصلاً صرف اُس کے پہلے ٹکڑے لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ کی خاطر پیش کی گئی، لیکن ضمناً یہ بات بھی سن لینے کی ہے کہ آیت قرآن کی اہم ترین و محکم ترین آیتوں میں سے ہے۔ اور حدیث ہی میں تو یہ صراحت اور بشارات موجود ہے کہ

من عمل بهذه الآية فقد استكمل

جس نے اس آیت پر عمل کر لیا، اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی۔

اور مفسر قرطبی نے لکھا ہے:-

وقال علماءنا هذه الآية عظيمة من أمهات أحكام القرآن

ہمارے علماء نے کہا ہے کہ یہ احکام قرآن کی کلیدی آیتوں میں سے ہے



اور آگے اس سے سولہ مسئلے عقائد و طاعات کے نکال کر گناے ہیں۔ صوفیہ محققین نے بھی آیت کو شریعت و طریقت کا جامع بتایا ہے اور ایک پُر لطف بات یہ بھی ہے کہ پادری ویری (WHERRY) صاحب جنہوں نے رسل کے انگریزی ترجمہ قرآن کو زمین بنا کر اس پر چار جلدیں اپنی تفسیر کی لکھ ڈالی ہیں، ان کے قلم سے قدرت عبارت لکھرائی ہے۔

”یہ آیت قرآن کی بلند ترین آیتوں میں سے ہے۔۔۔۔۔ ذات باری پر ایمان

نوع انسان کے ساتھ سلوک اس کو اس میں واضح طور پر مذہب کا جوہر صلی بنایا ہے

اس میں لب لباب عقائد اور اعمال کا آگیا ہے۔

غنیمت اور بہت غنیمت ہے کہ پادری صاحب موصوف کو قرآن مجید میں کچھ آیتیں تو بہت بلند قسم کی نظر آگئیں۔

### بجاء ۱۵

اس کے معاً بعد حکم قصاص کا شروع ہو جاتا ہے اور آیت قصاص کی آجاتی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (آیت ۱۷۸)

”اے ایمان والو تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے۔“

اس میں سرسری طور پر پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ اس حکم کے مخاطب کلمہ گو امت کے افراد نہیں کہ جس کسی کو کسی سے کوئی شکایت پیدا ہوتی، بس اُس نے اس کی مار کاٹا اندھا دھند شروع کر دی۔ حکم امت کے اہل حل و عقد کو مل رہا ہے۔ حکم انھیں مل رہا ہے جو ایک اجتماعی وجود اور طاقت رکھتے ہیں اور اپنی حکومت کے قانون پر نفاذ کی بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح سمجھنے کا دوسرا لفظ قصاص ہے۔ ”قصاص“ انتقام محض کے مرادف نہیں، بلکہ قانون نوعداری کے تحت انتقام کی ایک منظم و مندرجہ شکل کا نام ہے، اور امت کا ایک قانونی و اجتماعی حق ہے۔ اس کے نفاذ کی ذمہ داری عدالت پر عائد ہوتی ہے۔

اسلامی قصاص کا جزو اہم یہ ہے کہ قصاص میں مساوات ملحوظ رہے گی اور خون خون



سب کا برابر رہے گا یہ نہیں کہ اپنے شخص کی جان کی قیمت معمولی شخص کی جان سے زیادہ بھی جائے۔ ایک مقتول کے قصاص میں دوسری قوم یا پورے قبیلہ کو تباہ کر دیا جائے۔ عرب جاہلی میں ایک دستور یہ بھی پڑ گیا تھا کہ آزادوں میں سے کوئی اگر کسی غلام کو مار ڈالے تو قصاص میں جان اس آزاد کی لینے کے بجائے کسی غلام کی لی جاتی اور جاہلی عرب کا ایک دستور یہ بھی ہو گیا تھا کہ اگر قاتل کسی ادنیٰ قبیلہ کا شخص ہوتا تو کسی اعلیٰ قبیلہ کے ایک مقتول کے عوض قصاص اس ادنیٰ قبیلہ کے دو شخصوں سے لیا جاتا۔ اور دنیا کی تاریخ آج بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں۔ امریکہ میں آج بھی بلیک گورے (WHITE) کا خون ایک کالے (NEGRO) کے خون سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اور فرنگی حکومتیں ابھی چند ہی سال کی بات ہے کہ اپنے ایک مقتول کے عوض کالی قوم والے قاتل کے متعدد ہم قوموں کی جانیں لئے بغیر تسکین حاصل نہیں کرتی تھیں۔

یہاں پہنچ کر فقہائے مفسرین کے اس نکتہ سنی کی داد دیجئے کہ انہوں نے قصاص کی تفسیر میں صاف لکھ دیا ہے کہ:-

احی المسادات بینہما لا الزیادة -

قصاص سے مراد یہ ہے کہ بس اتنا ہی لیا جائے گا نہ زیادہ نہیں۔

اور سنی صاحب مدارک التفسیر کے الفاظ میں:

القصاص عبارة من المساوات والمعنى فرض علیکم

اعتبار المماثلة والمساواة من القتل

قصاص سے مراد مساوات ہے اور مطلب کہنے کا یہ ہے کہ قتل کے بائے

مماثلت و مساوات ہی کو دیکھا جائے گا۔

————— ۱۶ —————

قتل و قصاص کے سلسلہ میں ایک نیا لفظ قرآن کی زبان سے دیت کا سن لیجئے



یا کہ دو میں خون بہا۔

نیا اس معنی میں کہ دنیا کے اکثر مہذب قانونوں میں اس کا مرادف نہ ملے گا، رمیوں کے قانون میں قتل ایک فوجداری کا جرم تھا، دیوانی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا اور فرنگی قانون چونکہ اسی رومی قانون کا نقشہ ثانی ہے اس میں بھی جرم قتل صرف فوجداری کا جرم ہے لیکن اسلام چونکہ بین دین فطرت ہے۔ اس نے قتل کو ایک حد تک دیوانی کا جرم بھی تسلیم کیا ہے اور اس نے حقیقت سامنے رکھی ہے کہ قتل جس طرح ایٹھ یا حکومت اور سوسائٹی یا معاشرہ کے ایک قانون کی خلاف ورزی ہے، اسی طرح یہ بھرپور خطا اس کی شخصی حیثیت پر بھی ہے گویا یہ جرم دو گونہ حیثیت رکھتا ہے۔ ایک پبلک یا عمومی۔ دوسرے نجی یا انفرادی اسی لئے مقتول کے وارثوں یا خون کے پیوے کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ چاہیں تو قاتل کو درجہ سزا موت سے سزا دیں۔ اور اگر چاہیں تو خود مالی معاوضہ لے کر انتہائی سزا سے دست بردار ہو جائیں جس اسی کو اصطلاح شریعت میں دیت کہتے ہیں۔

DAMAGES کا انگریزی لفظ آپ نے سنا ہوگا۔ جب کسی ملک کی رعایا کا

خون دوسرے ملک میں ہو جاتا ہے اور اجنبی ملک میں فوجداری کا مقدمہ چلانے میں دشواریاں اور زحمتیں محسوس ہوتی ہیں تو جائز ہے کہ بجائے فوجداری استغاثہ اور اس کی پیروی کے صرف ہرجانہ کی مالی رقم پر کفایت کر لی جائے Damages اسی ہرجانہ کو کہتے ہیں اور ایک حد تک پشیل خون بہا کے ہے Damages کا لفظ آپ نے صاحب کی زبان سے سنا ہے، آپ کو مانوس معلوم ہوتا ہے، دیت یا خون بہا آپ صرف مولوں ملاؤں کی کتابوں میں پڑھتے ہیں، اس لئے قدر نا آپ کو نا مانوس معلوم ہوتا ہے۔

————— ۱۶ —————

آگے قاتل و مقتول دونوں کے فریقوں کو خوب تاکید ہے، عدل و رفق شر اور ظلم







عدل شعاروں کی قوم بن جائے، بلکہ امت کا مزاج ہی عدل و تقویٰ پر قائم ہو جائے۔

### ————— (۱۸) —————

روزمرہ کے احکام قرآن میں متفرق و متعدد مقامات میں نہیں ملتے۔ جو بھی حکم ملا ہے، مختصر جامعیت کے ساتھ ایک ہی مقام میں اور اس رکھنے کے قابل ہے۔  
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ  
عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۴﴾ (آیت ۱۸۴-۱۸۵)  
”اے مسلمانو تمھارے اوپر روزہ فرض کیا گیا ہے، جیسا کہ تم سے پیشتر  
لوگوں پر فرض ہو چکا ہے، یہ روزے گنتی کے چند روزہ ہیں۔“

روزے کے حکم سے طبعی وحشت دور کرنے کے لئے پہلے تو یہی فرمایا گیا ہے کہ  
یہ تمھارے لئے کوئی نیا حکم، کوئی نئی سختی نہیں، یہ حکم تو پہلی قوموں کو بھی مل چکا ہے۔ لیکن  
یہ مثبت صورت فرضیت کے لحاظ سے ہے، تعداد و زمانہ، مقصد و غایت وغیرہ کے لحاظ  
سے نہیں۔ روزے قمری جستری کے ذریعہ مہینہ میں ہوتے ہیں جسے ماہ رمضان کہا جاتا ہے  
اور ہر پانچ مہینہ کی طرح۔ مہینہ بھی گھوم پھر کر سال کے ہر موسم میں آتا رہتا ہے۔ صحت  
شرعیہ میں روزہ نام ہے طلوع فجر سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور عمل  
زوحیت کیلئے رہنے کا۔ اور حدیث میں سخت تاکید غیبت، فحش، جھوٹ، بدزبانی،  
دل آزاری وغیرہ ہر قسم کے گناہ سے بچنے کی آئی ہے۔ دنیا کی عینیں اس پر متفق ہیں کہ  
روزہ جسمانی بیماریوں کو دور کرنے والا اور علاج جسمانی کا ایک بہترین نسخہ ہے اور صحت نفس  
و تزکیہ روح میں جو اس سے مدد ملتی ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ پھر اس سے سپا سیرا نہ برداشت  
اور ضبط نفس کی تربیت جو تازہ ہو جاتی ہے اس کے لحاظ سے بھی مہینہ بھر کی یہ سالانہ مشق  
ایک بہترین پروگرام ہے۔



لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، ایک عجیب جامعیت کا لفظی تھا ساقیہ ہے جس کے اندر ساری ظاہری اور باطنی، اور انفرادی اور اجتماعی فضیلتیں آگئیں۔ گویا مقصود صرف حصول تقویٰ ہے۔ تقویٰ نفس کی ایک مستقل کیفیت کا نام ہے جس طرح مضر غذاؤں اور مضر عادتوں سے محتاط رہنے سے جسمانی صحت درست ہو جاتی ہے، بھوک کھل جاتی ہے، خون صالح پیدا ہونے لگتا ہے، مادی لذتوں سے لطف و انبساط کی صلاحیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح اس عالم آب و گل میں تقویٰ اختیار کئے رہنے سے آخرت کی نعمتوں سے لطف و انبساط کی صلاحیت انسان میں پوری طرح پیدا ہو کر رہتی ہے۔

اور معاً بعد ہے آیاتاً مَعْدُودَاتٍ، کم ہمتوں کی ڈھارس بندھانے کو یہ کہ کوئی بڑا طویل زمانہ اس کے لئے نہیں۔ دین مہینہ کی مسلسل مدت بھی اس کے لئے ضروری نہیں۔ کل ایک مہینہ کی مدت۔ اور پھر اس میں بھی بکثرت دعاہیں۔ قوی طور پر بیمار مستثنیٰ، مسافر مستثنیٰ، دیرینہ سال مستثنیٰ، اور ان میں سے کوئی معذور کی مستقل تو استثناء بھی مستقل۔ وحدت امت کی حکمت کے لحاظ سے لازمی تھا کہ زمانہ ایک ہی متعین ہو۔ چنانچہ زمانہ متعین اور درجہ شرائط بھی متعین۔

اور ایک بڑی رعایت فدیہ دینے کی ہے۔ عَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَہُ کے تحت۔ اطاعت کی پوری بحث یہاں دہرائیے تو خاصی طوائف کی نوبت آجائے۔ مختصر یہ کہ عربی میں وسعت اور طاقوت دونوں کے مفہوم الگ الگ ہیں۔ وسعت کے معنی تو گنجائش و امکان کے ہیں۔ کسی کام کو یہ سہولت انجام دے دینے کے ہیں۔ اور طاقوت یہ ہے کہ کوئی کام کرنے کو کر ڈالے لیکن مشقت کے بعد یا جان ہلکان کر کے ہی کر سکے۔ جن حضرات کو ذرا تفصیل سے اس بحث کے دیکھنے کا شوق ہو، وہ خاکسار کی تفسیر میں اس مقام کو ملاحظہ فرمائیں۔

اس سلسلہ کی آیتوں میں خصوصی اہمیت رکھنے والے الفاظ یہ ہیں:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (آیت ۱۸۰)

”سو تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پایہ کے تو چاہیے کہ وہ مہینہ بھر روئے رکھے“



اہم ترین لفظ "شہود شہر" کا ہے، یعنی ہینہ کے پالنے کا۔ یعنی فرضیت روزہ کی اس کے لئے ہے جو ماہ رمضان کا شہود کرے۔ اس ہینہ کو پائے لیکن اگر کوئی ملک ایسا ہو جہاں چاند شروع ہینہ میں طلوع ہی نہ ہوتا ہو وہاں فرضیت کا حکم ہی نہیں باقی رہے گا یہ اور بات ہے کہ وہاں بھی تاریخوں کا حساب کر کے رمضان ادا کر لے جیسے ان ملکوں میں جہاں صبح طلوع ہی نہیں ہوتا، یا برائے نام طلوع ہوتا ہے، نماز بھی گھڑی کے حساب لگا کر کسی طرح پڑھ لی جائے گی۔ آیت کے اندر ایسے الفاظ لے آنا جس سے استدلال ایسے نادر الوجود ملکوں کے وجود پر ہو سکے، اعجاز قرآنی نہیں تو اور کیا ہے؟

ابو بکر جصاص رازی، قدیم فقہائے حنفیہ میں مرتبہ امامت رکھتے ہیں اپنی مشہور کتاب احکام القرآن میں آیت میں مذکور مندرج احکام کا ذکر کرتے ہیں، وہاں برابر دل پر اسی شہود شہر کو بنیاد فرضیت قرار دیتے ہیں:-

فیه عدۃ احکام منها ایجاب الصیام علی من شہد  
لا علی من لم یشہد۔

"اس میں متعدد احکام ہیں، ان میں روزے کا وجوب ان کے لئے جنہوں نے ہینہ کو پایا، نہ کہ ان کے لئے جنہوں نے ہینہ کو نہیں پایا  
کتنے شبہات کا جواب اس ایک لفظ "شہود شہر" سے نکل آیا!

### ————— ۱۹ —————

بلاغت قرآنی کا ایک عام اسلوب یہ بھی ہے کہ جزئیات احکام بیان کرتے کرتے، بہ ظاہر محض برسیل تذکرہ یا اتفاقیہ کوئی عام قاعدہ یا اصولی نکتہ بیان کر دیا جاتا ہے جس کے اندر کوئی ہنر مغز ضرور ہوتا ہے چنانچہ صوم و صیام کے مسائل و احکام بیان کرتے کرتے پنج میں یہ فکر ابھی لئے آتا ہے:



يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ  
وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ - (آیت ۱۸۵)

” (ان عام انتظامات سے) اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور  
تمہارے حق میں دشواری نہیں چاہتا۔

یعنی یہ ساری رعایتیں اور سہولتیں جو بیان ہوئیں اس سے مقصود اللہ کو بندہ کے  
حق میں آسانیاں ہی فراہم کرنا ہے نہ کہ سختیاں اور دشواریاں۔ چنانچہ جو روزے قضا  
ہو جائیں، ان کی تکمیل اگر کر لو تو روزوں کی ادائیگی کا اجر پورا مل جائے گا، اور گناہاں کچھ  
نہیں اٹھانا پڑے گا۔ اور ایک صوم و صیام پر کیا موقوف ہے۔ ہر حکم کی تہ میں  
بندوں کے حق میں مصلحتیں اور رحمتیں ہی ملیں گی اور جہاں کوئی کبھی دشواری یا معذوری  
پیش آئی، پس اس کے مناسب و متناسب کوئی نہ کوئی رخصت یا رعایت بھی مل گئی۔  
اور مسائل رمضان و متعلقات رمضان کا ابھی تذکرہ ہی ہو رہا ہے کہ یہ آیت  
نظر پڑ جاتی ہے:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ  
الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي  
لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۝ (آیت ۱۸۵)

(اور اسے پیغمبر) آپ سے میرے بندے جب میرے باب میں سوال  
کریں آپ کہہ دیجئے کہ میں نزدیک ہی ہوں پکارنے والے کی پکار کا جواب  
دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے تو بندوں کو چاہیے کہ میرے احکام  
قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت یاب ہوں۔

بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دعا کے متعلق سوال یہ ایک الگ سے بات کہاں سے  
آگئی، لیکن ذرا غور کیجئے تو صاف سمجھ میں آجائے کہ رُوح میں جو جلا اس روزہ داری اور



شب بیداری سے پیدا ہوتی ہے، اُس کا عین تقاضا ہے کہ تعلق باللہ کی روح بیدار ہو اور طبیعت میں اللہ سے مانگنے، سوال کرنے اور اللہ کے آگے ہاتھ پھیلانے، گڑگڑانے کی ہوا سر پر سوار ہو۔ رمضان میں اس تعلق کی طلب اور تڑپ پیدا ہونا تو عین مقتضا حال کے مطابق ہے۔

پھر ایک اور باریکی ملاحظہ ہو۔ آیت میں خطاب براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اس میں اشارہ یہ ہے کہ جناب باری سے تعلق کے لئے تو سطر رسول اللہ ہی کے ساتھ مخصوص رکھنا اور انہیں چھوڑ کر کسی اور کی طرف گمان نہ لے جانا۔ خدا کے ساتھ بندوں کا ربط و تعلق جو قدیم مذہبوں کے سامنے ایک سخت گتھی ہمیشہ رہا کی ہے اور اکثر مذہبوں نے تو خدا کو اتنا دور اور بندوں سے اتنا بے فرض کر لیا ہے کہ اس تک رسائی گویا ممکن ہی نہیں۔ قرآن نے اس وہم کو دور کر دیا اور صفات صاف بتایا ہے کہ جسے تم دور سمجھ رہے ہو، وہ دور نہیں، نزدیک ہی ہے، اور اس سے تم ربط ہمیشہ ہی حاصل کر سکتے ہو۔ یہ قریب رہنا تو ہمیشہ ہی ہے اور رمضان میں اس عموم میں خصوص پیدا ہو جاتا ہے اور ربط خاص سے خاص تر ہو سکتا ہے۔ ذرا سوچئے، بندوں کے لئے تسلی، تسکین و راحت کا کتنا سامان اس آیت کے اندر رکھ دیا ہے۔

اپنے خدا کو ڈھونڈھنے کے لئے، اس سے راز و نیاز کرنے کے لئے کہیں اور نہیں جانا ہے، وہ تو ہم سے قریب ہی ہے۔

اگلا نکتہ اس آیت کے ذیل میں اور ہے۔ اس ایک آیت کے اندر ضمیر متکلم کتنی بار عَجَّتْیَ میں، فِیَّ تِیَ میں، اُجِیْبُ میں، دَعَاۤیَ میں، اِلَیَّ میں، بِیَ میں صیغہ واحد میں آتی ہے۔ زبان کے نکتہ سنجوں اور بلاغت کے راز و شناؤں کا قول یہاں ہنچکے پھر یاد کر لیجئے کہ ضمیر متکلم جس طرح دلالت کرتی ہے قدرت، عظمت و قوت پر، اقتدار و حکومت پر، ضمیر واحد متکلم اسی طرح مخصوص ہے التفات، اختصاص اور گناہت



کے لئے! ————— خوش نصیب بندے! تیرا پیر و گار تجھ کو کتنا اپنے  
 قریب کھینچتا جا رہا ہے!

آیت کے الفاظ پر نظر ایک بار پھر ہو، اُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ: پکارنے  
 والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں، ہر پکار سنتا ہوں، اس میں کوئی شبہ نہ ہو۔ اور پھر جن  
 دعاؤں کو قابل قبول سمجھتا ہوں انہیں قبول بھی کر لیتا ہوں۔ یہ نہیں فرمایا کہ میرے ہاں  
 ہر دعا سمجھا دھن قبول ہی ہو جاتی ہے۔ ہاں سُن، ہر دعا لی جاتی ہے، معقول یا نامعقول  
 بندہ غریب کو کیا خبر کہ کون اس کے حق میں مفید ہوگی، کون مضر۔ قبول تو بس وہی  
 دعائیں ہوں گی جو رحمت و حکمت مطلقہ کے منافی نہ ہوں گی۔

وَلْيُؤْمِنُوا بِيٰ  
 ایمان اگر وہ سرے سے کہیں اور رکھتے تو دعا ہی مجھ سے وہ کیوں کرتے۔ نہیں، بلکہ  
 ایمان لائیں میرے صفات کاملہ پر، میرے حکم ماننے پر، میرے حکم ماننے پر،  
 میرے قادر ہونے پر، اور میری رعایت نصالحہ پر

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝ تاکہ ان پر فوز و فلاح کی، ہدایت کی راہیں کھل  
 جائیں، تاکہ فلاح و ارین کے دروازے ان پر کھل کر رہیں اور ایمان کامل اور عمل حکم الہی  
 کے بعد ہر حربہ و رشد تک پہنچ جانے میں اہل اثبات بھی کیا ہو سکتا ہے؟

————— ﴿۲۰﴾ —————

جہاد و قتال کا ذکر تو قرآن مجید میں بار بار آیا ہے اور اس کے احکام قرآن کے  
 متفرق حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک جگہ اس غنم میں پارہ سبقل کے  
 نصت اول میں ہے:

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُنْقَوْنَ ۖ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا



التَّهْلُكَةِ ۖ وَاحْسِنُوا۟ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

”خروج کرتے رہو اللہ کی راہ میں اور اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں

نہ ڈالو اور نیک کام کرتے رہو۔ یہ شک اللہ نیک کام کو کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

جس جنگ کا نام شریعت کی اصطلاح میں جہاد ہے، اور جسے قرآن میں قتال

سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ ملک گیری کے لئے، سلطانی شان و شوکت کے لئے، عسکری

فتح مندی اور نام آوری کے لئے جائز نہیں۔ اس کے لئے سب سے بڑی سب سے کڑی

سب سے پہلی قید لگی ہوئی ہے فی سبیل اللہ کی، اللہ کی راہ میں ہونے کی۔ جان اللہ کی

سب سے بڑی نعمت ہے۔ وہ نفس کی راہ میں گزرنے کے لئے نہیں۔ صرف دین کی خدمت

میں پیش کر دینے کے لئے ہے۔ اور جان کے بعد ذکر مال کا نعمت کی حیثیت آتا ہے۔

اس کے لئے بھی شرط وہی فی سبیل اللہ کی لگی ہوئی۔ قدر اس صرف مال کی نہیں جو ہوائے نفس

کی راہ میں ہونا حق و باطل کے لئے ہو۔ لیکن اس حکم کے ساتھ یہ دوسرا حکم کیسا جڑا ہوا ہے

کہ اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں مت ڈالو یعنی یہ منع قتال کی تعلیم کیسی؟

جی نہیں، متع قتال کہاں؟ سیاق سے تو زمین تائیدی اور تائیدی حکم مل رہا ہے۔

کہ جہاد و قتال کا موقع آجائے نہ پر مجاہدوں کی مالی ضرورتوں کی طرف سے غفلت

ہرگز نہ برتی جائے ان کی مالی اعانت میں نخل کر کے امت کو تباہی و ہلاکت میں ہرگز نہ

ڈالو۔ دل کھول کر ان کی مدد کرتے رہو، اور اس موقع پر دست کشی کو بالکل ملی خود کشی کے

مراد نہ سمجھو! — اور آیت کا بقیہ حصہ اس کی تشریح و تقویت کے لئے ہے۔

التَّهْلُكَةِ کے یہی معنی صحابہؓ سے منقول ہیں۔ صحابیوں میں عبداللہ بن عباسؓ، ابو

ایوب انصاریؓ اور حذیفہؓ نے لئے ہیں۔ اور یہی تابعین میں حسن، قتادہ، علمہ اور عطاء

سے مروی ہیں

تو گویا آیت کے جو پہلو منع جہاد کا بے غوری کی بنا پر نکلتا ہوا معلوم ہوتا تھا، وہ



در حقیقت عین ترغیب و تاکید میں ہے۔ اور آخر آیت میں احسان اور محسنین میں اشارہ  
جو ادا اور مجاہدین ہی سے ہے۔ احسان یعنی عین غسل الہی غنوم میں ہے۔

### ————— پیچہ ۲۱ —————

احکام جہاد و قتال کے بعد ہی مسائل حج مشروع ہو جاتے ہیں، اور اس سلسلہ میں  
غازان حج سے خطاب کر کے آیا ہے:

وَتَزَوَّدُوا (آیت ۱۹) زاد راہ لے لیا کرو  
غیر مذہب والے غیر نہیں کہ اس حکم کو حسیہ سے سنیں اور کہنے لگیں کہ یہ حج کا سفر تو  
عین عبادتی سفر اور خدا کی راہ کا سفر ہے، اس کے ضمن میں یہ ظاہری مسائل پر زور کیا ہے  
اس کے لئے تو تدبیر تمام تر اس پر چھوڑ دینا چاہیے جس کی خاطر سفر کیا جا رہا ہے۔ تیر تھ یا ترا  
کی شان تو یہی ہے۔ اس سفر میں تو ہر اقدام ماسوا سے غلطی کی کا ہونا چاہیے۔  
جی نہیں۔ یہی تو بڑا فرق اسلام اور دوسرے مذہبوں کے درمیان ہے۔ قرآن کے  
سامنے تو ان ناقص مذہبوں کے نمونے موجود تھے جن کے پیرو تیر تھ یا ترا یا زیارت یا اثر  
و مقابر کے لئے نکلتے، تو مغلشن تلاش ہو کر، ننگے اور بھوکے اور مانگتے کھاتے ہوئے اور  
اپنا بار دوسروں پر ڈالتے ہوئے بد مذہب کے کھکشو تو خصوصاً اس امت میں مبتلا تھے اور  
عرب جاہلی کنکالی بن کر زیارت کو قابلِ فخر سمجھتے، حدیث بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس  
صحابی کی روایت ہے:

كان اهل اليمن ينجون ولا يتزودون ويقولون نحن  
المتوكلون فلما قدموا بمكة سألوا الناس۔

”یمن والے حج کرتے جاتے تو زاد راہ نہ لیتے بلکہ یہ کہتے رہتے کہ ہم تو  
متوکل ہیں اور جب کہ پہنچتے تو لوگوں سے مانگتے رہتے۔“



اور تفسیر ابن جریر میں ہے :

كانوا يجمعون بغیر زادكان بعضهم اذا احرم رعى  
ما معه من الزاد

”لوگ حج تو کرتے مگر بغیر زاد لئے ہوئے اور کوئی تو ایسا بھی ہوتا جو احرام  
پہن لینے کے بغیر زاد کو پھینک دیتا۔“

اور تفسیر طبری میں ہے :

من العرب كانت تجيء الى الحج بلا زاد ويقول بعضهم  
كيف نخرج بيت الله ولا يطعمنا

عربوں میں سے بعض حج کو آتے بلا کسی خوشہ راہ کے اور بعض ان میں سے کہتے ہم  
اللہ کے گھر کا حج کس طرح کریں تاکہ وہ ہمیں نہ کھلائے۔

تو قرآن کو اس جھوٹے توکل، اس نمائشی روحانیت سے روکنا اور ہر حاجی و زائر میں شخصی  
غیرت و خودداری پیدا کرنا تھا اور دوسری طرف اجتماعی معاشیات کو ایک خواہ مخواہ کے  
بار سے روکنا تھا اور ایک تمام غلط رسم و رواج سے نجات دلانا۔ اس لئے تاکید  
ارشاد ہوا ہے۔

وَتَزِدُّوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی وَالتَّقْوٰی يَأْتِي  
الْاَلْبَابَ ۝ (آیت ۱۹۷)

”اور زاد راہ لے لیا کرو، اور بہترین زاد راہ تقویٰ ہے۔ سو میرا ہی

تقویٰ اختیار کئے رہو، اسے اہل فہم۔

اور جس تقویٰ کو یہاں تاکید اور تکرار کے ساتھ کہا گیا ہے، اس کی ایک بڑی شرط ہے گداری  
سے احتراز اور دوسروں کے آگے دست سوالی دراز کرنے سے احتیاط، اور اپنا بار دوسروں  
ڈالنے سے اجتناب۔ قرآن کے بہترین ترجمانوں نے اس سیاق میں تقویٰ سے



مراد یہی لی ہے۔ کثافت میں سے۔

اٰی اتقوا الاستطعام و ابرام الناس والاشتغال علیہم  
”یعنی بچو لوگوں سے کھانا مانگنے سے، لوگوں سے لگے پٹنے سے، اور ان پر  
بارِ خاطر بننے سے۔“

اور مدارک میں ہے :-

الاتقاء عن الابرام والانشغل علیہم -

”سمجھنا ہے لوگوں کے لگے پٹنے اور ان پر بارِ خاطر ہونے سے۔“

اہمیت کے خاتمہ پر مخاطب اور لوالالباب یا اہل فہم سے خاص طور پر مرعنی ہے  
یعنی غور و فکر خود ہی نہیں نتیجہ تک پہنچا دے گا۔ اور فہم و تدبیر والے دل سے ایسی  
پر حرکت ہدایات کی قدر کریں گے۔ نتیجہ میں انفرادی، اجتماعی، روحانی، اخلاقی و معاشری  
سامانے ہی پہلو فوز و صلاح کے آجاتے ہیں

————— (۲۲) جینہ: —————

اور یہ جو ابھی عرض ہوا ہے کہ روحانی و اخلاقی کے ساتھ مادی فوز و صلاح بھی حاصل  
ہو گا تو اسے انکار کے کاغذوں سے نہ سنئے، اور اسے سن کر اچھٹھے میں نہ پڑیئے معاہدہ  
تفریل مبارک ہی میں صراحت کے ساتھ ارشاد ہوا جاتا ہے

لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَبِّكُمْ (آیت ۱۹۸)

اور کوئی مضائقہ نہیں اس باب میں کہ تم اپنے پروردگار کے پاس بھلائی کا تلاش معاش کرو

فَضْلًا کے کھلی ہوئی مراد مالی تجارتی منفعت ہے۔ اس مفہوم پر ابن عباس صحابی

سے لے کر تابعین تک متحد ہیں، اور یہاں بھی قرآن دوسرے مذہبوں کا خشک غلو توڑ رہا ہے  
اور رہبانیت کے تصور پر ضرب لگا رہا ہے۔



رہل جاہلیت کی خشکی کیسے یاد ہم پرستی، اس دیاب میں اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ  
جج کے موقع پر جو تاجر مال تجارت لے کر نئی و مکہ کے بازاروں میں اترتے تھے، بلکہ  
جو اوٹ والے اپنے اونٹ مکہ، عرفات، منی، مزدلفہ مکہ لے جاتے تھے، سمجھا جاتا تھا  
کہ ان لوگوں کا حج ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جہاں تجارت آگئی، عبادت کا وجود ہی کہاں  
باقی رہ گیا؟ قرآن مجید اپنے حکیمانہ اسلوب بیان کے ساتھ قدم قدم پر ان ساری غلط فہمیوں  
اور غلط غیرت مند یوں کے پردے چاک کرتا جاتا ہے، اور حقائق کے چہرے سے نقاب  
اٹھا دیتا ہے۔





# دوسرا خطبہ

۲۳۳ (۲۳۳)

عورت مرد کے باہمی تعلق اور تفاعل کا مسئلہ ہمیشہ سے بڑے معترف کا چلا آ رہا ہے۔ پُرانے فلسفہ اور پُرانے تمدن نے مرد کو آسمان پر چڑھا اور عورت کو زیر زمین اُتار دیا تھا اور فرنگستان جدید میں بھی خال خالی کوئی فلسفی، مفکر اور سوشیالوجسٹ اس آخری خیال کے پیدا ہونے سے نہیں۔ مثلاً جرمنی میں شوپنہار *Schopenhauer* برطانیہ میں کیپٹن لڈوسی اور میڈم شارلیپ *Madam Sharlip* اور ایران ہو کہ ہندوستان سب کہیں کہا تو میں مثلیں وغیرہ اسی مفہوم کی چلی آ رہی ہیں۔ لیکن جدید فرنگستان نے اسی کے رد عمل کے طور پر نظریہ بالکل ہی دوسرا رکھا ہے۔ یہاں عورت سر پر چڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اور قریب ہے کہ صنفِ نازک کی افضلیت اور اولیت کا اعلان بطور ایک مسئلہ کے ہو جائے۔ اب قرآن نے دیکھیے کبسا محتاط اور متوازن فیصلہ صادر کیا ہے۔

اصل اصولی اور بنیادی غامضی اس نے یہ بتایا ہے اور وہ بھی کس ایجاز کے ساتھ۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (آیت ۲۲۸)

اور عورتوں کا بھی ویسا ہی حق ہے جیسا کہ ان کے اوپر ہے موافق دستورِ شریعہ کے

سلیبس و عام فہم لادویں اسے یوں کہئے کہ جس طرح مردوں کے حق عورتوں کے

ہیں اسی طرح عورتوں کے حق مرد پر ہیں۔ اور یہ نہ سمجھو کہ شوہروں کے حق میں فرائض



بس یہودیوں کے ذمہ عائد ہوتے ہیں بلکہ ایسے ہی فرائض یہودیوں کے حق میں شوہروں کے ذمہ بھی عائد ہوتے ہیں اور یہ اصل اصول کی منادی چھٹی صدی کے ایک اُمتی عرب کی زبان سے اُس وقت کرانی گئی، جب دنیا میں یہودیت، نصراہیت، ہندو مت، مجوسیت، غرض بھی مذہبوں کی زبان سے کہلایا یہ جارہا تھا کہ

”شوہر یہودی کا آکار مالک ہے، اور یہودی اس کی ملوک“

”عورت جہنم کا دروازہ ہے اور ہر بشر میں شر کا باعث اسے حقیر و ذلیل سمجھنے کے لئے بس یہی کافی ہے کہ وہ عورت ہے۔“

ان دو عبارتوں میں یہودیت اور نصراہیت کی تعلیمات کا خلاصہ آکر گیا اور ایسا ہی کچھ حال چین کے حکیم کنفیوشس اور ہندو مت کے منو جی اور بدھ مت اور مجوسیت وغیرہ کے صحیفوں کا نظر آتا ہے۔ ان سب کے اقتباسات اگر نقل ہوں تو یہ خطبات اپنے اہل موضوع سے دور ہی جا پڑیں۔

اور جب قرآن نے عورت کی یہ اہم مساویانہ پوزیشن مضبوط کرالی، تو اپنی حقیقت پسندی اور حقیقت شناسی کی بنا پر اس اہم تکرار کو ضروری ضمیمہ کا بھی اعلان کر دیا، کہ

وَالرِّجَالُ عَلَىٰ هُنَّ دَرَجَةٌ (آیت ۲۲۸)

اور مردوں کو ان کے اوپر ایک گونہ فضلت حاصل ہے۔

قرآن جس طرح جاہلیتِ قدیم کے اس دعویٰ کو مسترد کر رہا ہے کہ عورت حقیر و ذلیل ہے۔ اسی طرح جاہلیتِ جدید کے بھی اس قول بے دلیل کے ماننے سے انکار کر رہا ہے کہ مرد و عورت ہر حیثیت سے مساوی اور ہر اعتبار سے ہم درجہ ہیں۔ مساواتِ کامل اور مساواتِ مطلق دونوں ضمیموں کے درمیان نہیں بلکہ مرد کو عورت پر من و جہ یا ایک گونہ ترجیح اور فوقیت حاصل ہے۔ قرآنی لفظ دَرَجَةٌ خوب خیالی میں رہے۔ مرد عورت کا مالک نہیں۔ عورت اس کی کنیز یا زرخیز نہیں۔ بلکہ لحاظِ وجوبِ حقوق دونوں ایک



سطح۔ بھوک جس طرح ایک کو لگے گی، دوسرے کو بھی۔ پھر بھی مرد کو عورت پر جسمانی و ذہنی ساخت اور ترکیب کے لحاظ سے ایک حد تک ترجیح و فضیلت حاصل ہے۔ علوم جدید خصوصاً نفسیات کے جن ماہرین نے اپنی عمر میں دونوں جنسوں کے طبعی خصوصیات جسمانی قوتوں اور دماغی و ذہنی صلاحیتوں کے مطالعہ و تحقیق میں صرت کر دی ہیں، ان کی بڑی جہالت اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے متمم و مکمل ہیں۔ تاہم بلحاظ قوت و بلحاظ عقل فضیلت مرد ہی کو حاصل ہے اور عورت جن ملکوں میں مردوں کے برابر ثابت بھی ہوئی ہے، وہاں اپنی نسائیت کا خون کر کے۔

اس اثبات فضیلت سے یہ مقصود ہرگز نہیں کہ فضل مفضل پر کسی قسم کا ظلم، زبردستی یا سختی شروع کر دے، یا اس کی تحقیر و تذلیل جائز سمجھ لے۔ بلکہ قوی کو کمزور سے اور زیادہ لطف و حسن مراعات رکھنا چاہیے۔ صحابی عبداللہ بن عباسؓ جس پایہ کے مفسر ہوئے ہیں، معلوم ہے۔ ان کا قول سنئے جو قرطبی میں نقل ہوا ہے۔

قال ابن عباسؓ الدرجة اشارة الى حسن الرجال على حسن المعاشرة والتوسع للنساء في المال والخلق ان الافضل ينبغي ان يتعامل على نفسه قال ابن عطية هذا القول نفيس مباح۔

ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ لفظ درجہ سے اشارتاً یہ ترغیب مرد کو ہوگئی کہ خدمت سے حسن معاشرت رکھے، ان مال اور برتاؤ دونوں میں اس کے ساتھ توسع برسنے۔ اس لئے کہ یہ افضل ہی کی شان ہے کہ اپنے نفس پر برداشت سے کام لے، اور ابن عطیہؒ نے کہا ہے یہ قول بہت ہی نفیس اور مستحسن ہے۔

اور آیت کا خاتمان لفظوں پر ہوا ہے۔



وَاللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ حَكِيمٌ ۝ اور اللہ بڑا زبردست ہے اور حکمت والا ہے۔  
 اللہ بڑی قوتوں کا مالک ہے اور ہر مانع پر غالب ہے، وہ جو احکام اپنے بندوں کو  
 پاس دے سکتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ بڑا حکیم بھی تو ہے، وہ دنیاوی احکام ہے جو ہمارے  
 حکمتوں اور مصلحتوں کے جامع ہوتے ہیں۔ بندوں بے چاروں کی نظریں کہاں کہاں تک  
 پہنچ سکتی ہیں۔۔۔ اور اسی شالی قوت و حکمت کے جلوے اور پر تو اس کے سائے  
 ہی احکام معاشری و انتظامی میں نظر آتے ہیں۔

### —: (۲۲۳) —:

زندگی سے محبت اور موت سے خوف، انسان کے لئے ایک امر طبعی ہے اس کا  
 لحاظ کر کے جہاد و قتال کے سلسلے میں عین ترغیب و ترہیب کے درمیان قرآن ایک  
 سبق آموز حکایت بھی کسی قدیم قوم کی بیان کرتا ہے اور چونکہ تذکرہ کا مدار اس قوم کی  
 تعین پر نہ تھا۔ اس لئے اس قوم کے زمانے اور وطن کو بالکل محل چھوڑے رکھتا ہے اور  
 انجام کا تعارف یوں گراتا ہے۔

الْمُتَرَاتِلِ الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ  
 حَذَرَ الْمَوْتِ ۝ (آیت ۲۲۳)

(اے مخاطب) کیا تجھے خبر نہیں ان لوگوں کی جو اپنے گھروں سے نکل  
 گئے تھے، موت کے ڈر سے اور وہ ہزاروں ہزار تھے۔

رویدہ سے مراد ہمیشہ چشم بھارت ہی سے نہیں ہوتی بلکہ خبر معتبر پہنچ جانا، یا  
 غور و فکر سے نتیجہ نکال لینا بھی مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں یہی مراد ہے۔ قرطبی نے  
 کہا ہے۔

هذه رواية القلب بمعنى الم تعلم به رواية قلب مراد الم تعلم کے



یعنی سمجھے کیا اسے مخاطب یہ روایت مستند نہیں پہنچ چکی ہے ؟ —  
 اور یہ طرز مخاطب ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کسی جانے بوجھے واقعے کے  
 عکس دلا نا ہوتا ہے۔ راغب میں ہے

اِذَا عُرِّيَ رَأْيٌ بِالْأَيْتِ مَعْنَى النَّظَرِ الْمُؤَدَّى إِلَى الْإِعْتِبَارِ  
 جَبَّ رَأْيٌ كَاصِلٌ إِلَى كَمِّ سَائِدَةٍ آتَا سَهْمٌ تَوْفِيقٌ كَسَى قَعْرَ  
 عِمْرَتٍ دَلَانَا هُوَ تَابٌ —

اور کثافات میں ہے :

هَذَا كَلَامٌ جَرَى بِجَرَى الْمَثَلِ فِي مَعْنَى الْعَجَبِ ،  
 مِثْلُ عَجَبٍ وَاقِعٍ كَرَأَى يَهْ طَرِزَ كَلَامٍ آتَا سَهْمٌ —

گویا مخاطبینِ ادل اہل عرب کے لئے یہ واقعہ معروف و معلوم تھا اور  
 اُلوف کا عدد عربی میں ہزار ہا ہزار کے لئے آتا ہے۔ اس کا اطلاق کم سے کم دس ہزار پر  
 ہوتا ہے۔

فِيهِ دَلِيلٌ عَلَى الْأُلُوفِ الْكَثِيرَةِ (کثافات)  
 ”اس میں دلیل ہے کہ وہ بہ کثرت ہزاروں میں تھے۔“

وَهُوَ جَمْعُ الْكَثْرَةِ لَا يُقَالُ فِي عَشْرَةٍ فَمَا دُونَهَا (قرطبی)

”یہ عدد جمع کثرت کا ہے اور دس ہزار یا اس سے کم کیلئے نہیں بولا جاتا۔“

اور حَدَّ الرِّمَاتِ کی تصریح نے بتا دیا کہ اتنی بڑی آبادی کا گھروں سے باہر نکل  
 پڑنا یوں ہی اور امر اتفاقی نہیں موت کے ڈر سے تھا۔

فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ (آیت ۲۴۳)

”تو اللہ نے ان سے کہا کہ مر جاؤ پھر اس نے انہیں جلا دیا۔“

یعنی اللہ کی مشیت میں ان کی موت ہی مقدر تھی اور جب اس نے یہ ارادہ کر لیا تو کوئی بھی



مدبر اس کی راہ میں ناکہ آسکی۔ اور ممکن ہے کہ وہ حکم جہاد ہی کی تعمیل سے جی چڑا کر بھاگے ہوں۔ لیکن بالآخر وہاں سے یا کسی اور طریقہ سے، اٹنے سب موت ہی کے شکار ہو کر رہے۔

سو حکم جہاد جہاد سے بھاگنا، یا بھاگ بچنے کی کوشش کرنا سب بے کام ہے۔  
 ثُمَّ أَحْيَاهُمْ، پھر اللہ نے انہیں زندہ کر دیا اور انہیں مشاہدہ کرا دیا کہ موت و زندگی کا سررہشہ کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے۔ عقل و تدبیر انسانی کے ہاتھ میں نہیں۔ اسی لئے جہاد یا کسی بھی دوسرے حکم شریعت کی تعمیل سے بھاگ بچنے کی کوشش کرنا انتہائی حماقت

اور نادانی ہے۔ کتاب عبد العزیز کے صحیفہ حرقی ایل باب ۳۷، آیات ۱ تا ۱۰ میں ایک روایت بہ صورت کشف و روایا اس سے ملتی جلتی ہوئی موجود ہے۔ اور بعض علما کے علم نے قرآن ہی کی دوسری آیتوں سے استناد کر کے یہاں موت و حیات دونوں کو صرف معنوی و مجازی مفہوم میں لیا ہے۔ ان تاویلات کی قرآن میں گنجائش توکل سکتی ہے، مگر بے تکلف۔ اور آیت کا خاتمہ اس ٹکڑے پر کیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرُ النَّاسِ

لَا يَشْكُرُونَ ۝ (آیت ۲۴۳)

”بے شک اللہ انسانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ البتہ انسان ہی اکثر شکر ادا نہیں کرتے۔“

چنانچہ فضل کرنے والا پروردگار بندوں کو حکم انہیں کے نفع کے لئے دیتا رہتا ہے۔ اور اس کا امتثال یہ ہے کہ بندوں کے دل میں جذباتِ تمامہ محبت کے اور شکر و حسانِ مہدی کے پیدا ہوتے رہیں اور قہقہے ہوں یا احکامِ پنج پنج میں ایسے مضمون ایسے ہی جذبات کی بیداری اور استحضار کے لئے آتے جاتے ہیں۔

————— (۲۵) پتہ: —————

اس قدیم قوم کی حکایت کے، کتنا چاہیے کہ بعد ہی ذکر اسرائیل میں حضرت



سمویل کے زمانہ کی ایک جنگ کا شروع ہو جاتا ہے۔

الَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَأِ مِنْ بَنِي إِسْرَآئِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى  
إِذْ قَالُوا لِنَبِيِّ لَّهُمْ أَبْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلَ فِي  
سَبِيلِ اللَّهِ (آیت ۲۴۶)

اے مخاطب! کیا تجھے خبر نہیں کہ موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت  
کی، جب کہ ان لوگوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم لوگوں کے لیے ایک امیر مقرر  
کر دیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں۔

پیغمبر حضرت اسموئل تھے۔ حضرت موسیٰ کے زمانے سے کوئی تین صدی بعد،  
حضرت داؤد سے کچھ ہی قبل، اور سسہ سبھی سے کوئی دس، گیارہ سو سال قبل مسیح ق م  
سے تا مسیح ق م ۱۰۰۰ افرایم و علاقہ شام کے کوہستانی شہر رامہ میں آپ کا قیام تھا۔ آیت  
میں یہ بھی تصریح موجود ہے کہ آپ اس وقت بوڑھے ہو چکے تھے، آپ کے فرزندوں میں  
سہ سالاری اور قیادت کی قابلیت نہ تھی۔ ملک کے دشمنوں نے خاص طور پر اٹھایا تھا اور اسرائیلیوں  
شکست ہو رہی تھی۔

مَلِكٌ عَرَبِيٌّ مِمَّنْ فِي غَمَامٍ۔ ہر صاحب قوت و اقتدار کے لئے ہے۔ یہاں سیاق  
میں مراد امیر جیش یا سردار فوج سے ہے۔ قوریت میں اس موقع پر ہے:

”تب سارے اسرائیل بزرگ جمع ہو کر راہ میں سمویل کے پاس آئے اور  
اس سے کہا کہ دیکھ تو بوڑھا ہوا ہے اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے۔ اب  
تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر جو ہم پر حکومت کرے جیسا کہ سب قوموں میں ہے۔“

(۱۔ سمویل ۸ : ۵، ۴)

اسرائیلی قصور بادشاہی میں فوج کی سرداری لازمی تھی، اور یہ درخواست گزار  
سب مذہبی لوگ تھے، ملک گیری و کشور کشائی مقصود نہ تھی، جنگ کی سبب اللہ متصور تھی۔ نقائل



کے ساتھ قید فی سَبِيلِ اللّٰہ کی درخواست ہی میں لگی ہوئی تھی اور یہ نہیں کہ خود جس کو چاہیں خود رانی سے سروا مقرر کر لیں۔ پھر وقت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست اُن سے کی کہ وہ امیر حبش کسی کو مقرر کریں۔

مذہبیت اور دینی ذہنیت کے ان مظاہروں کے باوجود پھر نفسیت بشری بھی خوب واقف تھے اور اپنی قوم کی نفسیت سے تو شاید کچھ اور زیادہ ہی۔

قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُنْتُمْ عَلَيَّ الْفَتْحَ اَلَّا تَقَاتِلُوْا  
 ”بولے کہ میں یہ تو نہیں کہ تم پر قتال فرض کر دیا جائے اور پھر تم قتال نہ کرو“  
 بلکہ کلمہ اَھْل سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سہیل بھی کچھ سمجھ بھی رہے تھے  
 قَالُوْا وَمَا لَنَا اِلَّا نَقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاءِنَا رَاٰت

(قوم دالے) ”بولے کہ ہمارے لئے کیا ایسا باعث ہو سکتا ہے کہ ہم قتال نہ کریں خدا کی راہ میں بلکہ ہم اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے نکالے بھی جا چکے ہیں۔“

یعنی یہ بھی کوئی بات ہے کہ خود ہی آپ سے جنگ کا تقاضہ کرنے آئے ہیں اور جب اس کا حکم صادر ہو جائے گا اور جہاد فریضہ مذہبی خدا کی راہ میں تو اس حکم کے بعد اس کی تعمیل سے جی خیرا نے لگیں۔ خصوصاً جب کہ ہم کو ان کے ہاتھوں اتنے جانی و مالی نقصان بھی اٹھانا پڑ چکے ہوں! ————— لیکن بات آخر ان کے پیسر ہی کی سچی نکلی۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ قَالُوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ  
 ”لیکن جب ان پر قتال فرض کیا گیا تو وہ اب کھل گئے بجز ان میں سے تھوڑوں کے۔“

ان کے قدیم ترین مؤرخ جوزیفوس کی *Antiquities of The Jews* میں ہے۔



”ان پر دہشت طاری ہو گئی یعنی پہاڑوں میں چھپ گئے بعضوں نے  
ذریعہ زمین غاروں میں پناہ لی اور بہت سے لوگ قراپنا ملک چھوڑ کر دیارِ اُسے  
یہ دن عبور کر گئے“ (باب ۶ فصل ۶ فقرہ ۱)

اور اس حقیقت سے امد سے رہے کہ نہ

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظَّالِمِيْنَ (آیت ۲۲۶) اللہ خوب واقف ہے ظالموں سے۔

اسے نافرمان بندوں اور ان کی سزا پر بھی ہر طرح قادر ہے

اس کے بعد کیا ہوا؟ اسے بھی قرآن ہی کی زبان سے سنئے :-

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا (آیت ۲۲۷)

”ان کے پیغمبر نے ان لوگوں سے کہا کہ اللہ نے تم پر طالوت کو امیر مقرر کر دیا ہے۔“

یہ طالوت کون اور کیا تھے؟ نبی اور رسول کچھ نہ تھے محض امیر جمیش تھے اور

تاریخ نے ان کو اسرائیل کا پہلا بادشاہ تسلیم کیا ہے۔ زمانہ حکومت ۱۲۰۰ قبل مسیح سے

لے کر ۱۲۰۰ قبل مسیح تک۔ توریت میں اس کا نام (Saul) ساول کر کے آیا ہے

توریت میں حسب معمول بڑی طوالت بیان کے بعد ہے :-

”سو جب معمول ساول سے دو چار ہوا تو وہیں خداوند نے کہا کہ دیکھ یہی

شخص ہے جس کی بابت میں نے تجھ سے کہا تھا کہ یہی میرے لوگوں پر

ریاست کرے گا“ (۱۔ سمویل ۹۔ ۱۵۔ ۱۶)

اب اور آگے سنئے۔ سمویل نبی اپنی اُمت کے کیسے رمز شناس تھے، ان کی فراست و توقع

سے بھی بڑھ کر ٹھیک نکلی۔ کہاں تو تقاضہ پر تقاضہ تھا کہ امیر جمیش کا انتظام ہو جائے اور اب

جب خدائی انتخاب کے واسطے ہو گیا، تو لگے کہنے، واہ یہ بھی کوئی انتخاب ہو سکتا ہے۔

قَالُوا اَنۡیۡ یَّکُوْنُ لَہُ الْمُلٰکُ عَلَیْنَا وَہُنَّ اَحَقُّ بِالْمُلٰکِ

مِنْہٗ وَکُمۡ یُّکُوْنَتۡ سَعۡدَۃً مِّنَ الْمَالِ (آیت ۲۲۸)



”بولے اس کو ہمارے اوپر امیری کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم امارت کے

حق دار اس سے بڑھ کر ہیں اور نہ اسے مال ہی میں وسعت دی گئی ہے۔“

طاوت کی جو حقارت اسرائیلیوں کے دل میں مٹھتی ہوئی تھی۔ اس کی ٹھوڑی سی  
شرح تارتیج کی زبانی بھی سن لیجئے۔

اسرائیلی بارہ قوموں میں بٹے ہوئے تھے، ان میں سب کے چھوٹا قبیلہ بن یامین کا  
تھا، اور طاوت اتفاات سے اسی قبیلہ کے تھے، تو ایک باعث ان کے حقیر سمجھے  
جانے کا یہ نکل آیا۔ نسل و خاندان کی اہمیت جب جائز حدود سے بڑھ جاتی ہے، تو  
ہندوؤں کی طرح ذات پات، بلکہ چھوت چھات کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوؤں کے  
برہمن اور چھتری کی تفریق و امتیاز کی طرح اب اسرائیلیوں کا بھی عقیدہ یہ قائم ہو گیا تھا کہ  
نبوت حق مخصوص ہے بنی لاوہ کا اور حکومت حق مخصوص ہے بنی یوذاہ کا۔ یہود کا  
قول تھا کہ طاوت نہ اس میں نہ اس میں، پھر حاکم یہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ جیسے ہندو عوام کی  
سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کوئی شخص، نہ برہمن نہ چھتری وہ حاکم اعلیٰ یا سردار کیسے تسلیم  
کر لیا جائے۔؟

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ برہمن یا چھتری نہیں ہیں نہ سہی، یہ ویش بھی تو نہیں۔  
ہاجن یا ساہوکار طبقہ کے بھی تو نہیں، یا ہ دمرتہ میں نہ سہی، کم سے کم مال و دولت ہی میں  
ہمارے عوام سے ممتاز ہوں! منسوب امارت کے لائق تو مالی اعتبار سے بھی نہیں!  
مکالمہ میں آپ سامعین و حاضرین کا دل لگ رہا ہے؟ اب بنی وقت کا بیان  
بھی کیجئے۔

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَكُمْ بَسْطَةً فِي  
الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْكُمْ مَّلٰكَةً مِّنْ بَنِيْ اٰدَمَ  
”فرمایا کہ اسے اللہ نے تمہارے مقابلہ میں انتخاب کر لیا ہے اور اسے علم



اور جسم (دونوں) میں کُشاوگی زیادہ دی ہے اور اشر جسے چاہتا ہے  
اسے اپنا ملک دے دیتا ہے۔“

آپ نے پہلا اور اصلی جواب تو یہی دیا کہ یہ انتخاب اشر کا کیا ہوا ہے اور ظاہر ہے  
کہ ہر طرح پر حکمت و مصلحت بھی ہوگا، بندوں کے ذہن بھی ان باریک مصلحتوں تک  
نہیں پہنچ سکتے

توریت نے اسے یوں ادا کیا ہے :

”اور سمویل نے جماعت کو کہا کہ تم اسے دیکھتے ہو، کہ جسے خدا نے

پُجن لیا، تو اس کی مانند سارے لوگوں میں ایک بھی نہیں (۱ سمویل - ۱۰-۱۲)

اور دوسرا جواب عقلی قسم کا یہ دیا کہ تم اپنے معیار سے بھی دیکھ لو اور تمہارے معیار سے بھی سردار  
فوج میں بس یہی دو چیزیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ اسے سپہ داری اور ملک گیری کے فزون سے  
واقفیت ہو، سودہ طاووت کو حاصل ہے، دوسرے خود اس کی جسمی وجاہت و توانائی، اسکی  
اہمیت اس زمانہ کی دست بہ دست لڑائیوں میں ستم تھی اور طاووت اس میں کبھی متاثر تھے۔

فِي الْعِلْمِ سے مراد سیاق میں علوم ملک گیری و ملک داری کے ہیں، ابن عباسؓ  
نے کہا ہے ای علم الحرب اور روح المعانی میں ہے من حرفة الامور السياسية۔  
فی الجسم مراد ہے کہ قد و قامت اور وجاہت ظاہری میں طاووت دوسروں کے  
بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں ای فی الطول والقوة۔

توریت کی وہی ہونی تفصیلات سے طاووت کے حلیہ کا نقشہ ذہن میں جملہ کیجئے۔

”بہت خوب جوان تھا اور بنی اسرائیل کے درمیان اس سے ذائد

خوب صورت کوئی شخص نہ تھا۔ یہ ساری قوم میں کانندہ سے لے کر اوپر تک

ہر ایک کے ادب تھا۔“ (۱ سمویل - ۹-۱)

ایک دوسری جگہ :-



”اور وہ جماعت کے درمیان کھڑا ہوا تو شاؤں سے لے کر ادیتک سب لوگوں سے لمبا تھا“ (۱- سموئل - ۱۰ = ۱۳)

اور یہ دراز قامتی، اسرائیلوں کے ہاں کوئی معمولی صفت نہیں، بڑی اہم اور ضروری صفت سرداری کے لئے تھی، تو ریت کے بعد مقدس ترین نوشتہ ان لوگوں کے ہاں نمود ہے۔ ذرا اس کی تصریح ملاحظہ ہو:

”خداوند تبارک و تعالیٰ اپنی سیکنت کا نزول صرف اسی شخص پر کرتا ہے

جو دانشمند ہو مضبوط ہو، اور دراز قامت ہو“ (EVERY MAN)

(TAL MOOD - ۱۲۸)

قرآن مجید کی اس نکتہ رسی کی یاد دیجئے کہ اس نے نام ہی ایسا رکھا جس بے طول قامتی کی طرف پورا اشارہ ہو رہا ہو۔ ہمارے ہاں کے اہل تحقیق کا گروہ اسی طرف گیا ہے۔

چنانچہ صاحبِ معالم نے کہا ہے کہ *مکان طالوت اسمہ بالعبرانیۃ ساؤل فسمی طالوت بطولہ*۔ اور روح المعانی میں ہے، قال اند عربی من الطول واصلہ الطولون۔

یُوَاقِ مُلْکَہُ مَنْ یَّشَاءُ، اس کی ملک تو ہر ملک ہے وہی اپنا ملک جس کو چاہے دے دے۔ وہی ہر طرح مالک و مختار ہے اور آیت کا توڑ ان مختصر لفظوں پر ہوا ہے۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلَیْہِمْ جِسْمٌ اُودٌ مِّنْ یُّوْسَیْنِ کہ اس کا اختیار بھی غیر محدود و دلور اس کا علم بھی محیط کل — وہ بڑی ہی وسعت والا ہے جس کے اختیار میں سب کچھ ہے، وہی ہر پست کو بلند اور ہر ادنیٰ کو سرفراز کر دینے والا ہے اور اس کا علم بھی محیط و کامل ہے، وہی تو واقف ہے کہ کون ملک داری اور ملک گیری کی صلاحیت رکھتا ہے۔ نبی اپنی اُمت کی اعجوبہ پرستی اور خوارقِ پسندی سے واقف تھے، جوابات تو



ان کے اعتراض کے معقول و کافی دے چکے تھے، پھر بھی کچھ دیر مغز پاشی ضروری مناسب معلوم ہوئی۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ  
التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ  
آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي  
ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُمُ إِن كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝ (آیت ۲۴۸)

”ان کے نبی ان سے بولے، کہ اس کی امارت کا نشان (یعنی جو تمہارے  
اطمینان کا کام دے سکے) یہ ہے تمہارے پاس وہ صندوق (از خود)  
آجائے گا۔ جس کے اندر تمہاری تسکین کا سامان تمہارے پروردگار کی طرف  
سے ہے، اور کچھ بچی ہوئی چیزیں بھی جنہیں آل موسیٰ و آل ہارون چھوڑ  
گئے ہیں اسے فرشتے لے آئیں گے۔ بیشک اس واقعہ میں تمہارے لئے  
نشانی ہے اگر تم ایمان دالے ہو۔“

تقریر میں تابوت سکینہ ایک قصہ طلب لفظ آگیا ہے۔ اس تلمیح کو آپ بھی  
سمجھ لیجئے تو گفتنی بالکل کھل جائے اور بات خوب روشن ہو کر رہے۔

یہ اصطلاحی نام ایک خاص تابوت کا ہے، جو بنی اسرائیل کا اہم ترین فرمی دلی درخت تھا  
اس کے اندر اصل نسخہ قریت کا تھا، اور انبیاء و بنی اسرائیل کے تبرکات محفوظ تھے، اسرائیلی  
اس کو برکت و تقدیس کی متاع عزیز سمجھتے تھے۔ اور اس کے ساتھ بڑاؤ انتہائی احترام کا  
رکھتے تھے۔ سفر و حضر، جنگ و امن ہر حال میں اسے بڑی عزت و حفاظت کے ساتھ  
اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اور اپنی ساری خوش بختی اس کے ساتھ وابستہ سمجھتے تھے۔ یہ صندوق  
کچھ ایسا بڑا نہ تھا۔ موجودہ علمائے یہودی کی تحقیق کے مطابق اس کی پیمائش یہی: طول ۲½  
فٹ، عرض ۱½ فٹ، بلندی ۱½ فٹ۔ مدت دراز ہوئی فلسطینی ایک جنگ میں



ان سے یہ چھین لے گئے تھے، اسرائیلی اسے اپنے حق میں انتہائی نحوست اور بدطالعی سمجھ اس کی بازیابی کے لئے نہایت درجہ مضطرب و پریشان تھے۔ طاہریت کے وقت میں اس کی واپسی کے بعد یہ تابوت ان کے قبضہ میں حضرت سلیمان (متوفی ۹۳۲ ق م) تک رہا، اور آپ نے بیت المقدس میں یہی سلیمانی کی تعمیر کے بعد اسے بھی اسی میں رکھ دیا تھا، اس کے بعد سے پھر اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہود کا عام خیال یہ ہے کہ یہ تابوت یہی سلیمانی کی بنیادوں کے اندر دفن کر دیا گیا ہے۔

قرآنی لفظ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ سے خصوصی اشارہ تورات شریف کے نسخہ اشفا کی جانب ہے اور آل موسیٰ اور آل ہارون کی چھوڑی ہوئی چیزوں سے مراد ان دونوں پیغمبروں اور ان کی بزرگ اولاد کے تبرکات و آثار ہیں۔

تاریخ یہود کا بیان ہے کہ فلسطینی اس مقدس تابوت کو چھیننے کو تو چھین لائے۔ لیکن جب سے ایک دن بھی چین سے نہ بیٹھنے پائے۔ ابھی دبا کا زور ہے، ابھی کوئی اور مصیبت، آخر عاجز آکر یہ طے کیا کہ خود تابوت یعنی اس نحوست کی پوٹ کو کہیں اور پھنک دیا جائے۔ چنانچہ ایک بیل گاڑی پر اسے لا کر بغیر گاڑی بان کے یوں ہی بانک دیا۔ بیل سیدھے علاقہ بنی اسرائیل کی طرف روانہ ہو گئے اور گاڑی اُن کے شہر بیت شمس میں آکر ٹھہر گئی۔

تَحْمِيلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ کی خبر کو حیرت کے کاڑوں سے نہٹنے۔ ایسے موقعوں کے لئے ہمیشہ یہ نکتہ حافظہ میں رکھیے کہ تکوینی تصرفات جب بھی حکم الہی سے ہوتے ہیں، کیا معمول کے موافق کیا معمول سے الگ، ہمیشہ فرشتوں ہی کے ذریعے سے ہوتے ہیں اور کلام الہی میں ہر فعل و عمل کے لئے محاورہ فرشتوں ہی کا استعمال ہوتے ہیں۔ پانی سے بھرے ہوئے بادل فرشتے ہی لاتے ہیں۔ آندھی کے جھکڑ فرشتے ہی چلاتے ہیں، قحط، دبا، زلزلے سب فرشتوں ہی کی معرفت ظہور میں آتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی



بیلوں کا رخ اسرائیلی علاقوں کی جانب پھیر دینا فرشتوں ہی کا کام تھا۔ یہ ایک غیبی نشان تھا، طاوت کی تائید میں، اور مبارک خالی تھی اس کے حق میں۔ اس مرتبہ انگریز واقعہ بازیابی تاوت کی طرف اشارہ کر کے نبی وقت اپنی امت سے کہتے ہیں کہ تمہارے اطمینان کے لئے تصرف غیبی کا ثبوت موجود ہو گیا۔ اس قبل و قال اور مذاکرے اور مکالمے کے بعد، جب امت طاوت کی کمان میں، قتال پر آمادہ و مستعد ہو گئی تو خود سردار جیش کو ایک ضرورت گفتگو کی فوج والوں سے پیش آ گئی۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ (آیت ۲۴۵)

”جب طاوت فوج والوں کو لے کر آگے بڑھے تو بولے کہ اللہ

تمہارا امتحان ایک دریا کے ذریعہ لینا چاہتا ہے۔“

جس دریا کا ذکر ہے وہ فنا نہیں ہو گیا ہے آج تک موجود ہے، اس کا نام اردن

انگریزی تلفظ میں (Jordan) کوئی بڑا دریا نہیں، کتنا چاہیے کہ منبع سے دہانہ تک براہ راست لمبائی ۱۳۰ میل کی۔ البتہ درمیانی پیچ و خم ملا کے لمبائی کی میزان کوئی تین سو میل تک پہنچ جاتی ہے۔ علاقہ فلسطین میں گویا اہم ترین دریا یہی ہے۔ اور علاقہ

کی قدرتی سرحد کا کام بھی یہی دیتا ہے چنانچہ دریائے اس پار اور اس پار (اس و اسی اور اُن و اُن) کے علاقوں کی تقسیم خود قدرت میں موجود ہے۔ اور یہ ذکر صحیفہ توبہ کے باب اول کی آیات ۱۴-۱۵ میں ہے اس کا بہاد

شمال سے جنوب کی جانب ہے اور بحر ہلیل (Sea of Galilee) اور بحر طبریہ (Sea of Tiberias) ہوا بحر المیت یا بحر مردہ (Dead Sea) میں جاگرتا ہے۔ پانی شروع کے حصہ میں صاف و شفا بخش و شیریں ہے۔ لیکن آگے چل کر گندلا، بدبودار اور مضر صحت ہو جاتا ہے۔

تو تمہارے صبر و ضبط (ڈسپلن) کا امتحان، مشیت و حکمت الہی سے اسی دریا



کے ذریعہ سیر ہوگا۔

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۝

”پس جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا وہ میرا نہیں ہے۔  
وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ  
”اور جو کوئی اسے نہ کھائے گا وہی میرا ہے، ہاں کوئی ان میں چلو بھرا اپنے  
ہاتھ سے پی لے (تو اس کا سفائقہ نہیں)

”میرا نہیں ہے“ سے مراد نہیں کہ وہ میرے دین و کیش سے خارج ہے، بلکہ مراد  
یہ کہ میری فوجی اطاعت سے باہر ہے، اور سرے قائم کئے ہوئے ڈسپلن کا پابند نہیں۔  
روایتوں میں آتا ہے کہ موسم گرمی کا تھا اور سپاہیوں کو پیاس زدہ کی لگی ہوئی تھی۔ اور معلوم  
ایسا ہوتا ہے کہ اصل حکم تو وہی ملا تھا کہ کوئی بھی راستہ میں یہ پانی زبان پر نہ رکھے۔ اور یہ  
دوسرا حکم بطور نصرت و اجازت تھا، کہ خیر ایک آدھ چلو سے منہ نہ کرنے میں کوئی سفائقہ نہیں  
— باقی قصہ آگے سنئے :

فَشَرَبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۝

پی لیا، بجز ان میں چند آدمیوں کے۔

یعنی خلافتِ حکم اچھی طرح سیر ہو کر پی لیا۔ جس کے بعد چلنا خصوصاً فوجی مارچ کرنا قدرتنا دشوار  
ہو گیا۔ باز رہنے والوں کی تعداد جو قرآن نے تھوڑی ہی بتائی ہے، وہ حسبِ ایت تو ریت  
تقریباً چھ سو تھی۔ تب سمجھیں ان لوگوں کو جو اس کے پاس حاضر تھے، اگنا اور وہ

مرد قریب چھ سو کے تھے (۱۔ سمجھیں ۱۲ = ۱۵)

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ

لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۝ (آیت ۲۴۹)

”پھر طالوت اور جو مومنین ان کے ساتھ تھے، دریا کو پار کر گئے۔ تو وہ لوگ



بولے آج تو ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں سے مقابلہ کی سکت نہیں۔

جالوت فلسطینیوں کے لشکر کا سردار بڑے تن و توش کا پہلوان تھا۔ انسان کا ہے کو  
تھا، اچھا خاصا دیوزاد تھا۔ توریت میں اس کی جسامت، قدم قامت، اسکی شد زوری  
اس کے ہتھیار، ان سب کی تفصیلات موجود ہیں، ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا  
قدمش فٹ کا تھا، بجز چہرے کے سب پر تک آہن پوش رہتا تھا، اور اس کی  
پسیر کا وزن کوئی تین من کا تھا۔

دشمن کو اپنے سے قوی و زبردست پا کر اچھے اچھے ایمان والوں کی بہت طبعی  
طور پر جواب دے جاتی ہے۔ جو یفیس اسرائیل کی تاریخ آثار یہودیہ میں ہے کہ طاووت  
اور اس کے لشکری یہ سامان دیکھ کر سم اٹھے، (باب ۶ - ۹ - ۱۰)  
اور خود توریت کا بیان ہے۔

”جس وقت ساؤل اور سارے اسرائیل نے اس فلسطینی کی بات سنی  
تو ان کی دلادری نکل گئی، اور وہ نہپٹ ڈر گئے“ (۱ - سمویل - ۱۷ - ۱۱)  
قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُوا اللَّهِ ۖ كَمْ مِنْ فِئَةٍ  
قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ  
مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ (آیت ۲۵۹)

”وہ لوگ جنہیں یقین تھا کہ وہ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، بولے  
کہ بارہا چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں اور  
اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

طاووت کے لشکر میں مومن تو بھی تھے، لیکن بہتوں پر دشمن کے ظاہری سازو  
سامان کی دہشت طاری ہو گئی، اور طبعی طور پر اس کی شان و شوکت سے مرعوب ہو گئے۔  
البتہ کچھ ایسے بھی تھے جن میں آخرت کا عقیدہ تروتازہ اور مستحضر تھا، وہ اس وقت پر



بھی اپنے ایمان پر استغلاٰل کے ساتھ قائم رہے اور ذرا بھی متزلزل نہ ہوئے اور حقیقت تو یہی ہے کہ اللہ صابرین کا ساتھی ہے۔ اس کی نصرت و توفیق انھیں لوگوں کے ساتھ ہے اور آخرت کا انحصار جن لوگوں میں ہے وہی ان میں جرأت و بے خوفی پیدا کرتا ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (آیت ۲۵)

”جب جالوت اور اس کے لشکریوں کے مقابل آئے تو بولے کہ اے

پروردگار ہمارے اوپر صبر ڈال دے اور ہمارے قدم جمادے اور ہمیں

غالب کر کا فر لوگوں پر۔“

یہ دو آیتیں جو ابھی آپ کے سامنے تلاوت ہوئیں، ان میں عام تعلیم اللہ کے سپاہیوں کو آداب جنگ کی ہے کہ کامل تکیہ سپاہیوں کو بجائے اپنی قوت و شوکت کے نصرت الہی پر ہونا چاہیے۔

قرآن کا بیان تو آپ سنتے ہی چلے آ رہے ہیں۔ اور تورات کا بیان جس کا جی چاہے، خود تورت میں پڑھ کر دیکھ لے، تورت میں نفس جنگ کے خشاک و خادجی واقعات تفصیل قرآن سے کہیں زائد ہے۔ اور وہ پس معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی کتاب تذکرہ و تاریخ کی ہے۔ قرآن مجید اس کے برعکس ہر موقع پر تعلیم، اصول توحید اور اخلاق عالی کی دیتا جاتا ہے، اور یہی وہ اس موقع پر بھی کر رہا ہے۔

چنانچہ أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا میں سب سے پہلے ہی درخواست کی ہے، کہ ہمیں توفیق صبر و ثبات قلب کی ہو، اور ثَبِّتْ أَقْدَامَنَا میں صراحت اسی دعا کی ہے کہ ہمیں ثبات قدم نصیب ہو۔ رہی وَانصُرْنَا کی دعا تو ثبات قلب و ثبات قدم کے بعد دشمن پر ظفر و غلبہ تو شاید بہ طور قدرتی فتح کے حاصل ہو ہی جاتا۔ لیکن مومنین صادقین کی نظر اپنے سارے انتظام اور ساری سعی و تدبیر سے کہیں بڑھ کر نصرت و تائید الہی پر رہتی ہے



اور پھر آخر میں صراحت عَلٰی الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ کی ہے۔ یعنی جنگ کوئی ملکی یا دنیوی نہیں دینی و اعتقادی ہے، مقابل محض دشمن نہیں، کافر ہیں۔ مقصود فسح اور غلبہ دشمنوں پر نہیں، بلکہ کافروں اور دین کے دشمنوں پر ہے۔

فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ قَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ (آیت ۲۵۱)

”پھر انھوں (طا لوت والوں) نے انھیں (جالوت والوں کو) شکست دیدی

اللہ کے حکم سے اور جالوت کو داؤد نے قتل کر ڈالا۔

بِإِذْنِ اللَّهِ کی قید ملاحظہ رہے۔ اذن توفیق کے معنی میں ہے مقبولین کا کوئی سا

بھی کارنامہ ہو اس قید سے بچھا چھوٹنے نہیں پاتا۔ یاد دہانی ہر جگہ ہوتی رہتی ہے کہ بنو بچا را کیا کرے گا۔ جب کچھ بھی اس سے بن پڑتا ہے، تائید و توفیق حق ہی سے ہوتا ہے۔

جنگ و ترتیب جنگ کی منظر کشی تو ریت میں بھی ہے، لیکن بس وہی فکری نقطہ نظر سے

دَقَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ، دشمن کے بطل جلیل اور سردار اعظم جالوت کی ہلاکت

داؤد کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ داؤد کون تھے؟ آگے چل کر تاریخ اسرائیل کے ایک نامور سردار تھے۔

ملک و سلطنت سے سرفراز ہوئے اور نبوت سے بھی۔ اس وقت لشکر طا لوت کے ایک غلام سپاہی

تھے، زمانہ حکومت ۱۲۰۰ ق۔ م سے ۹۷۰ ق۔ م تک رہا۔

قرآن مجید میں آپ کا ذکر چھ مرتبہ آیا ہے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ اس نو عمر سپاہی نے

ایک پتھر اپنے غلام خن میں رکھ کر ایسا اس کے کھینچ کر مارا کہ پتھر اس کے ہاتھ کو توڑنا ہوا اس کے

دماغ کے اندر پہنچا، ہو گیا اور جالوت تڑپ کر معاد دنیا سے رخصت ہو گیا۔

وَاللَّهُ الْمَلِكُ وَالْحَكِيمُ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ (آیت ۲۵۱)

اور اللہ نے اسے حکومت عطا کی اور حکمت بھی اور اسے سکھایا جو کچھ چاہا۔

یہ بادشاہی ایک خدائی عطیہ تھی۔ پہلے تو قرآن نے اسی کو صاف کیا ہے کہ یہ فرمانروائی

ان کے واسطے قوم اسرائیل کو عطا ہوئی تھی۔ آپ نسل اسرائیل کے دوسرے تاجدار ہوئے ہیں



پہلے تاجدارِ طاوت تھے اور آپ ان کے داماد بھی تھے۔ طاوت جب اپنے بڑے فرزند کے ساتھ میدانِ جنگ میں کام آگئے تو قبیلہ یہود نے آپ کو بادشاہ منتخب کیا اور دو سال کی کشمکش کے بعد قوم کے باقی قبیلوں نے بھی آپ ہی پر اتفاق کر لیا۔ سات سال تک آپ نے پایہ تخت ہبرون (Hebron) کو رکھا۔ اس کے بعد یروشلم کو دشمنوں کے قبضہ سے چھڑا کر اسے اپنا دارالسلطنت بنایا۔ گرد و پیش کے حکمرانوں کو مسخر و مغلوب کیا۔ اپنے حدودِ سلطنت کو خوب وسیع کیا۔ آپ کا عہد حکومت تاریخ اسرائیل میں فتوحات اور حسن انتظام کے لحاظ سے یادگار ہے۔

وَالْحِكْمَةُ حُكْمٌ كَيْفِيٌّ دَانَانِيٌّ كَيْفِيٌّ  
نام دانائی کا ہے عَلَمُهُ مِمَّا يَشَاءُ علوم انبیاء کا احاطہ کون کر سکتا ہے۔ مِمَّا يَشَاءُ  
کے عموم میں وہ تمام علوم و فنون و صنائع آگئے جو آپ کو تعلیم ہوئے تھے۔  
قصہ طاوت طویل ہو کر بیان ہوا۔ آخری آیت کا آخری ٹکڑا بہ طور ضمیمہ یا تکرار ہے  
اور اسی میں قصہ کا خلاصہ بھی آگیا۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ  
الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ (آیت ۲۵۱)

اور اگر اللہ انسانوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا تو زمین پر

فساد برپا ہو جاتا۔ لیکن اللہ تو جہانِ دالوں پر بڑا فضل رکھنے والا ہے

اس لئے اللہ اپنے فضل و کرم سے اس فسادِ عظیم کی نوبت نہیں آنے دیتا اور بدکاروں کو

نیک کاروں کے، اور نافرمانوں کو فرمانبرداروں کے ذریعہ ہٹاتا اور مٹاتا رہتا ہے لَفَسَدَتِ

الْأَرْضُ کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ بدی و بدکاری سے روئے زمین پر فسادِ عظیم برپا ہو کر رہتا۔

یہاں یہ عام قانون بتا دیا گیا کہ دنیا کی حکومتوں اور سلطنتوں کے جو انقلابات ہوا کرتے

ہیں یہ یونہی بلا ضرورت و مصلحت محض گردشِ گردوں سے نہیں ہو جاتا کرتے بلکہ ہمیشہ با مقصد



پر حکمت ہی ہوا کرتے ہیں۔ اور ان سے ظلم و ظغیان و عصیان کی اصلاح، نظر ہوتی ہے اور ہمیں اس حقیقت پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے کہ اس عالم اسباب میں مشیت تکوینی جو کام بھی لیتی ہے، بندوں ہی کے ذریعہ و واسطے سے لیتی ہے اور روئے زمین پر فساد و عظیم کے برپا ہو جانے پر جو شے رو کے ہوئے ہے وہ اللہ کا فضل عظیم ہی ہے۔

یاد کر لیجئے اس لمبے قصے کے ذرا قبل حکم جہاد کا ملا تھا، اور ترغیب قتالی کی شروع ہوئی تھی، طریق جہاد، آداب جہاد، متعلقات جہاد کے سلسلے میں کتنی ہدایتیں کتنی بصیرتیں اس ایک تاریخی قصے کے ضمن میں فراہم ہو گئیں۔

### —: (۲۶) :—

اس قصہ کے خاتمہ پر معارف و سخن براہ راست صاحب قرآن کی طرف ہو جاتا ہے اور آپ سے مخاطب ہو کر ارشاد ہوتا ہے۔

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ تَنْزِلُهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (آیت ۲۵۲)

یہ اللہ کی آیتیں ہیں کہ ہم انھیں آپ کو (اسے رسول) پڑھ کر سناتے ہیں  
ٹھیک ٹھیک۔

بِالْحَقِّ یعنی غرض صحیح کے ساتھ اور بالکل بے کم و کاست۔ یہ گویا پروردگار اعلان اس کا کہ صحیح و مستند بیان قرآن ہی کا ہے، یہ نہیں کہ دوسری الہامی کتابوں اور مذہبی نوشتوں کی طرح کے قصے اُدھورے یا مبالغہ آموز یا مسخ شدہ ہو کر رہ گئے ہوں۔ اور اس کی ایک واضح مثال یہ قصہ طاہریت ہی ہے۔ بائبل والوں نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (آیت ۲۵۲)

تو آپ یقیناً فرستادوں میں سے ہیں۔



آپ اپنے پیغمبر برحق ہونے میں اصلاً شک و شبہ نہ کیجئے۔ اور حقائق کا نزول برحق پیغمبروں ہی پر ہوتا ہے۔ لفظ الْمُرْسَلِينَ کی معنویت قابل غور ہے، انبیاء کی حیثیت اسلام میں تمام تر قاصدوں، سفیروں، فرستادوں اور بھیجے ہوؤں کی ہوتی ہے اور جو مرسل (بھیجا ہوا) ہوتا ہے وہ کسی کی طرف سے کسی کے پاس ہی بھیجا ہوا ہوتا ہے۔ یہ مرسلین یا پیامبر نہ اوتار ہوتے ہیں نہ دیوتا، نہ خدا کے منظر ہوتے ہیں۔ نہ خدا ان کے اندر حلول کئے ہوتا ہے۔ معبودیت یا نیم معبودیت کی صلاحیت ان میں ذرا بھی نہیں ہوتی۔ اللہ اکبر! — شرک بلکہ شائبہ شرک سے بچنے کا بھی قرآن مجید کو کتنا اہتمام ہے الفاظ تک کے انتخاب میں وہ اس کا کیسا کاغذ رکھتا ہے۔

لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ کی ترکیب سے یہ بھی نکل آیا کہ آپ دنیا سے نزلے والے ان کے کوئی مرسل نہیں بلکہ آپ اس زمرہ مرسلین کے ایک فرد ہیں جو آپ سے پہلے گزر چکے ہیں۔

### —: (۲۷) بیچ: —

اور اس سلسلے میں یہ مسئلہ بھی کس خوبی سے حل کر دیا ہے۔ کہ پیغمبر پیغمبر سب یکساں مرتبہ عظمت و احترام کے نہیں ہوتے۔ گو احترام مشترک سب میں رہتا ہے۔ بادشاہ کے صوبہ داروں میں تفاضل بھی پایا جاتا ہے، گو فضیلت سب میں مشترک ہوتی ہے اور شرفِ تقرب سے کوئی خالی نہیں ہوتا

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ (آیت ۱۵۳)

اور رسولوں میں ہم نے کسی کو کسی پر فضیلت دے رکھی ہے۔  
فَضَّلْنَا میں ضمیر جمع متکلم کا خیال رہے۔ یہ تفضیل و افضلیت جو کچھ ہے وہ محض عند اللہ ہے، خالق کے ہاں درجات و مراتب قرب کے اعتبار سے ہے۔ خلق کے لئے بحیثیت مطاع و مقتدا سب یکساں ہیں۔ اکرام و تعظیم سب کی واجب ہے (اور اسی



معنی میں قرآن مجید کی ایک دوسری آیت کا جزو اسی پارے کے اندر لا نُفَرِّقُ بَيْنَ  
 أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ آ رہا ہے) چنانچہ :  
 مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللَّهُ

انہیں میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا ہے (براہِ راست بلا واسطہ ملائکہ)  
 جیسا کہ خصوصیت کے ساتھ موسیٰ کلیم اللہ کے لئے آیا  
 وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۚ وَكَانَ رَسُولُكَ مِنْ هَٰؤُلَاءِ  
 ہیں، جیسے ہمارے رسول سرورِ نبیاء، جامع کمالات، و خاتم النبوت تھے مفسرِ زمخشری  
 نے یہ خوب کہا ہے کہ جہاں شناخت و تعیین میں کوئی وقت نہ ہو، وہاں کنایہ صراحت سے  
 بڑھ کر لیش و مؤثر ہوتا ہے :

وَالَّتِي نَا عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ الْبَيْتِ وَآتَيْنَاهُ  
 بِرُوحِ الْقُدُسِ (آیت ۲۵۳)

اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے شواہد عطا کئے اور ہم نے ان کی تائید کی روح القدس کے  
 ذریعے (کہ وہ بھی انہیں پیرانِ برحق میں سے تھے)  
 ابْنُ مَرْيَمَ - یعنی مریم نامی ایک خاتون کے فرزند، نہ ابن اللہ یا کچھ اور۔ عیسیٰ  
 علیہ السلام بہ ایں مرتبہ و جلالت بہر حال ایک بشر ہی گوشت و پوست کے بنے ہوئے  
 اور انسانی شکل و صورت رکھنے والی ہی عورت کی اولاد تھے، نہ خدا تھے نہ خدا زادے،  
 نہ الوہیت کا کوئی شاہد اپنے اندر رکھتے تھے، انہیں خدا کا بیٹا ٹھہرانا بڑی جہالت تھی،  
 اور اسی لئے تو ضرورت پیش آگئی انہیں صراحت کے ساتھ ابن مریم کہنے کی، کہ محض اسی  
 نشانِ دہی سے اور اسی پتے ہی سے ضرب لگ جائے عقیدہ نصرانیت پر، ورنہ قرآن نے اتنے  
 پیغمبروں کا ذکر کیا ہے، کسی کا تعارف یہ کہہ کر یا کہ فلاں ابن فلاں - اس طرح کا تعارف  
 مخصوص ہے ابن مریم کے لئے۔ کہ انہیں کے لئے تو عقیدہ ابن اللہیت کی تردید کی



ضرورت تھی، البتّات یعنی شواہد، ان کی حقانیت و پیمبری کے۔ اور اس کے تحت وہ دلائل و خوارق سب ہی آگے جنھیں دیکھ کر ہر عقل سلیم نبوت عیسوی کی قائل ہو جائے ابھی تردید ہو رہی تھی شرک نصرانیت کی، اب تردید ہو رہی ہے الحاد یہودیت کی۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ آپ پیمبرِ برحق اور مؤیدِ من اللہ تھے۔ نہ کہ نعوذ باللہ شعبہ بازی باز یا گمراہ، نصرانیوں نے جس طرح غلو و افراط کر کے آپ کو حدِ عبودیت سے اونچا اچھال دیا تھا۔ اسی طرح یہود نے عناد و تعریط سے کام لے کر آپ کو بازی گمراہ شعبہ باز قرار دے دیا تھا۔ امر حق اور قول فیصل اب قرآن کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔

وَأَيُّدُنَا بِرُوحِ الْقُدُسِ کہ روح القدس قدم قدم پر آپ کی محافظت و مدافعت دشمنوں سے کرتے تھے۔

یہ روح القدس عیسائی تثلیث والے کوئی اقنوم نعوذ باللہ نہ تھے۔ بلکہ اسلامی اصطلاح میں یہ لقب ہے فرشتہ اعظم حضرت جبریل کا، جبریل ملکوتی مخلوق ہیں عند اللہ نہایت مقرب لیکن بہر حال مخلوق ہی ہیں، اور کوئی بھی شاہد الوہیت کا اپنے اندر نہیں رکھتے۔  
وَأَيُّدُنَا ان کی تائید ہم نے کی جو قادر علی الاطلاق ہیں اور یہ تائید کوئی خود بخود تو نہیں مل گئی۔ آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑ گئی کہ عیسیٰ مسیح ہر ایں ہمہ فضائل و کمالات بہر حال انسان ہی ہیں۔ انسانوں کی طرح دفع ضرر اور حصول نفع دونوں کے لئے دستگیر مٹی تھی کے محتاج۔ اور قدرت کاملہ نے ان کی حفاظت، رفاقت، و تقویت کے لئے ڈیڑھ ایک دوسری مخلوق لطیف و غیر مرئی جنس کی لگا دی!

— ﴿۲۸﴾ —

آیت انگریزی کی مشہور آیت سے ہر شخص واقف ہے۔ اس کی تہید کی آیت ہے۔  
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ مَا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ



أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خِلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ  
هُمْ الظَّالِمُونَ ۝ (آیت ۲۵۴)

اے ایمان والو جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو اور اللہ کی راہ میں، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ تجارت کام آئے گی نہ دوستی اور نہ سفارش اور کافر ہی تو ظالم ہیں۔

انفاق یعنی صرف مال کا ذکر سیاق و سراج میں جہاں کہیں بھی قرآن مجید میں آتا ہے، ظاہر ہے کہ نیکی یا راہ خدا ہی میں آتا ہے۔ اس کے لئے یہاں یہ پہلے ہی کتنی بار یاد دہانی کر دی گئی ہے کہ جس میں بھی خرچ کر دو گے، وہ آمدنی آتی کہاں سے ہے۔ بہر حال اللہ ہی کی دی ہوئی ہوتی ہے۔ تو اس مال عطیہ الہی کو اسی دنیا میں نیک کاموں میں قبل قیامت خرچ کر دو، اور قیامت کا نام بجائے صراحت سے لینے کے، اس کا تعارف ان علامتوں سے کرایا ہے، کہ

- (۱) اس دن کسی طرح کی سودا بازی، لین دین، خرید و فروخت نہ ہو سکے گی،
- (۲) اور نہ کوئی محبت و دوستی اور قربت دامنی کا رشتہ چل سکے گا،
- (۳) اور نہ کسی بڑے شخص کی سعی و سفارش، اس کی وجاہت، مروت یا دباؤ کی بنا پر قابل قبول ہوگی،

لیکن نفی صراحت کے ساتھ ان تین باتوں کی کیوں ہے؟ وجہ یہ کہ یہی تین گمراہیاں تو شدت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ گمراہ قوم اول تو حشر و یوم حساب کی قائل کہاں تھیں؟ اور جو اہل کتاب کے اثر سے، یا خود اہل کتاب قومیں، تھوڑی بہت اس کی تھیں بھی، تو طرح طرح کی پختہ عجب لگا رکھی تھیں، کہیں عقیدہ تھا کہ اہل ثروت تو وہاں بھی مالدار ہوں گے۔ اپنی بڑیاں کچھ دے دلا کر دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دینگے اور ان کی نیکیاں کچھ خرچ کر کے اپنی طرف منتقل کر لیں گے۔ اور کہیں یہ عقیدہ تھا کہ



دوستی عزیز داری کی بنا پر یہ کاریاں حسنات میں تبدیل ہو جائیں گی، اور جسکے بڑھ کر یہ عقیدہ پھیلا ہوا تھا کہ فلاں فلاں بزرگ آباؤ اجداد مقبول و مقرب اپنی سفارش کے ذریعہ اپنی اولاد کو یا اپنے جاننے والوں کو چھڑالائیں گے۔ یہ آخری فتنہ جسکے بڑھا ہوا تھا اور دینِ نصرانیت کی بنیاد ہی ان دو عقیدوں پر ہے۔ ایک عقیدہ کفارہ، جس کے معنی ہیں کہ ابن اللہ نے ساری دنیا کے گناہگاروں کی طرف سے قدیم یا کفارہ بن کر اپنی جان سولی پر دے دی۔ اور دوسرا عقیدہ شفاعت، جس کا مطلب یہ ہے کہ مسیح ابن اللہ کا مستقل منصب شافع مطلق کا ہے۔ عرش الہی پر ممکن یہی کئے جائیں گے اور بے دریغ شفاعت کر کے اپنے ماننے والوں کو نجات دلوائتے جائیں گے۔

اسلامی شفاعت جو ہے، وہ کوئی مستقل شفاعت ہی نہیں بلکہ ایک صورت مقبولین کی دعا کی ہے۔ مقبولین حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ایما و پارہ پا کر درخواست کریں گے، دعا کریں گے کہ فلاں فلاں کے قصوروں کو، خطاؤں کو نظر انداز کر کے انھیں مغفرت سے نواز دیا جائے۔ اور یہ دُعا ان لوگوں کے حق میں قبول ہوگی۔ چنانچہ اسی آیت الکرسی کے دوسرے ٹکڑے میں ہے:

مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَنَا إِلَّا بِإِذْنِهِ

کون ایسا ہے جو اللہ کے آگے شفاعت کر سکے، ہاں سوا اس کے کہ اسی کی

اجازت سے ہو۔

یعنی شفاعت تو تواسر حق، حق تعالیٰ ہی کا ہے۔ **يَللّٰهُ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا** ہاں وہی خود جس کسی کو چاہتا ہے اس کا مجاز کر دیتا ہے اور یہ ظاہر اس کی درخواست قبول کر کے اس کا اعزاز سب کی نظر میں دوبالا کر دیتا ہے۔

جاہلی اور نیم جاہلی قوموں کی گمراہیاں اگر پوری طرح نظر میں ہوں تو ان آیتوں کی قدر و قیمت اور معنویت نظر میں خوب رہج جاتی ہیں۔



— (۲۹) ترجمہ: —

بزرگ آیت الکرسی اور اس کے بزرگ فضائل سے گزر کر اب آپ اس مقام پر آتے ہیں جہاں رئیس المومنین حضرت شہر ابراہیم خلیل اللہ کا مکالمہ و مناظرہ اپنے ایک معاصر بادشاہ سے درج ذیل ہے :-

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ اللَّهُ  
الْمَلِكُ (آیت ۲۵۸)

(اے مخاطب) کیا تو نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں کیا جو ابراہیم سے ان کے پروردگار کے باب میں مباحثہ کر رہا تھا اس (شخص) میں اگر اللہ نے اسے بادشاہت دے رکھی تھی ۔

قرآن مجید میں اس بادشاہ کا نام اور پتا نشان کچھ درج نہیں میسر میں نے اس کا نام فرود لکھا ہے اور وہ بادشاہ بابل یا کلدانیہ کا تھا۔ حضرت ابراہیم کے زمانے کی تاریخ بہت دھندلی ہے۔ اس لیے بادشاہ کا صحیح نام اور پتہ اب تک تاریخ کے صفحات میں نہیں مل سکا ہے۔ تو یہ بات کچھ ایسے پوچھے کی نہیں۔ فرود ہی خدا معلوم اس کا اصلی نام تھا یا یہ صرف اس کا عربی تلفظ ہے۔ بہر حال اس نام کے ایک بادشاہ کا ذکر تورات میں دو جگہ آیا ہے۔ اور دونوں جگہ سخت ظالم کی حیثیت سے۔ ایک جگہ صحیفہ پیدائش کے باب ۱۰ کی آیت ۹ میں ہے۔

”..... سے فرود پیدا ہوا۔ وہ زمین پر قہار ہونے لگا اور خداوند کے

سامنے وہ قہار و جبار تھا“

اور دوسری جگہ صحیفہ ۱۔ تورات کے باب ۱ کی آیت ۱۰ میں ہے :-

”وہ زمین پر جبار ہونے لگا“

اور جیوش انسائیکلو پیڈیا میں روایات یہود کے حوالے سے ہے :-



”نمرد زین کا بادشاہ ہو گیا، اور آزر کو اس نے اپنا وزیر بنایا، اس کے بعد اپنی عظمت کے نشہ میں نمرد خدا سے بیگانہ ہو گیا۔ اور بہت سخت قسم کا مشرک ہو گیا“ (جلد ۹ صفحہ ۳۰۹)

اور اتنی صراحت انسانی کلچر یا آرت ریلیجن اینڈ آئیٹھکس میں ملتی ہے، کہ بابل کی تاریخ میں ایک بادشاہ کا نام آتا ہے، بابل کا سب سے پہلا انسانی خدا تھا۔ اور بعض مورخین نے اسے نمرد کا بڑا بیٹ قرار دیا ہے۔

اِنَّ اَتَمَّهُ اللّٰهُ الْمَلٰٓئِكُ مِیْنَ اَنْ لَا تَکَ مَعْنٰی مِیْنَ هِیَ۔ یعنی اللہ نے جو اسے بادشاہت سے سرفراز کر دیا تھا، یہی اسے کبر و پندار پر لے آیا۔ اور اسی نے اس میں سرکشی اور طغیانی پیدا کر دی۔

اَلَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مباحثہ و مناظرہ شروع اس نے کیا تھا کہ پیغمبر و قسطنطین۔

فِیْ رَیْبٍ اسے ظاہر کر رہا ہے کہ گفتگو باب الوہیت میں نہ تھی، منکر و مشرک فرماں رواؤں کو ٹھوکر باب ربوبیت ہی میں لگی ہے۔ اپنے متعلق الوہیت کا دعویٰ تو شاید ہی کسی کو ہوا ہو۔ دعوائے سہیجہ بھی بدیہی البطلان۔

حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں کلدانیوں کا مذہب اصلاً شمس پرستی کا۔ یعنی سورج دیوتا کی پوجا کا تھا دوسرے دیوی دیوتاؤں کا سوا یہی تھا۔ اسی کا منظر یا اور تیار عجیب نہیں کہ نمرد کلدانی اپنے کو سمجھ رہا ہو۔ اور اہل توحید کو سرکاری مذہب کا دشمن و غدار اور ایسے خدا سے باطل کو اہل توحید سے جلن اور جھنجھلاہٹ پیدا ہو جانا قدرتی تھا۔ یہود کے مورخ قدیم جودیفیس کی تاریخ آثار یہود میں ذکر ہے :-

”لوگوں کی خوش حالی کو خدا کی جانب نسبت دینے سے روکنے لگا، گویا کہ وہ خود قادر علی الاطلاق تھا، کہتا تھا کہ اگر ہم کی خدا نے طوفان نوح کی طرح دنیا کو ڈبوایا تو



میں اس سے انتقام لوں گا“ (باب اول سیکشن ۱ پیر ۳ -)

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ (آیت ۲۵۸)

جب کہ ابراہیم نے اس سے کہا کہ میرا خدا وہی ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔

یہ آپ نے یقیناً اس کے اسی سوال کے جواب میں کہا ہو گا کہ وہ کون سا خدا ہے جس کے تم پرستار ہو؟ غمزدہ تو مدعی اپنے رب اور مظهر خدا ہونے کا تھا، اس نے داعی فرحید کو چیلنج دے کر پوچھا ہو گا کہ وہ کون سا خدا ہے؟ جس کی طرف تم دعوت دیتے رہے ہو، ذرا اس کے اوصاف تو مجھے سناؤ۔۔۔۔۔ مشرک افراد آج بھی بڑے اچھے سے پوچھا کرتے ہیں کہ ہمارے فلاں فلاں دیوی دیوتاؤں کے علاوہ، اور ان سے مادرا آخر خدا ہے کون سا؟ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ اس کے افعال و صفات کیا ہیں؟ کچھ اس رنگ کے سوال اس وقت بھی ہوتے ہوں گے۔

آپ نے جواب میں فرمایا ہو گا کہ حیات و موت کی ساری قومیں اسی کے ہاتھ میں ہیں وہی ساری نظام ربوبیت کا سرچشمہ ہے، کائنات حیاتی کی بقا و فنا کے سارے قانون اور ضابطے آخر میں اسی پر جا کر ٹھہرتے ہیں۔ کسی ہستی میں بھی یہ طاقت نہیں کہ اس نظام بقائی و فنائی کو بدل دے۔ یا اس میں کوئی ادنیٰ سا تصرف کر دکھائے۔

علم کلام جسے ہمارے غالی صوفیا بڑی حد تک حقارت سے دیکھتے ہیں، بلکہ مشکلم کو گمراہ و بد دین سمجھتے ہیں تو آپ نے دیکھ لیا کہ اُسے بد دینی کے درجہ پر رکھنا کجا، اس کا اثبات تو سنتِ انبیاء سے ہو رہا ہے!

قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ ط

وہ بولا کہ زندہ گی اور موت تو میں دیتا ہوں۔

بے دین کی عقل ہی کتنی! موت و حیات کے اسباب بعید و خفی کو تو اس نے چھوڑا صرف اسباب سطحی و قریبی کو سامنے رکھ کر بولا کہ سامانِ معیشت تو سب میرے ہاتھ میں ہے۔



جسے چاہوں زندہ رہنے دوں، اور جسے چاہوں بھوکوں مار ڈالوں۔ یا اور جس طرح چاہوں اس کی زندگی کا خاتمہ کروں۔

ابراہیم ذکی نے جب دیکھا کہ اتنی بڑی بات بھی مخاطب غیبی کی سمجھ میں نہ آئی تو آپ نے ایک دوسرا پیرایہ اور زیادہ عام فہم اختیار کیا۔

قَالَ اِبْرَاهِيْمُ قَاتِلَ اللّٰهِ يَاقِيْنَ بِالْشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ  
قَاتِلِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ -

ابراہیم نے کہا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا مغرب سے نکال کر دکھا۔

موجودہ عظیم نے استدلال کو زیادہ قریب ہنس بنانے کے لئے یہ دوسری مثال جھٹ سے پیش کر دی، کہ تو سورج دیر تا کا اوتار بنا پھرتا ہے۔ اور اسی دیوتا کے قادر و تصرف ہونے کا ڈھنڈور چاہیے تو زیادہ نہیں تو ذرا اتنا ہی کر دکھا کہ سورج عام قانون الہی سے ہٹ کر کسی دن ذرا اُرخ اور سمت ہی بدل دے۔ دوسروں پر قدرت و تصرف رکھنا الگ رہا ذرا اپنے ہی اوپر تصرف کر کے دکھا دے۔ تصرف بھی صرف اتنا کہ اپنا رخ بجائے ادھر کے ادھر کر دے۔ آپ نے نفس استدلال وہی قائم رکھا، صرف مخاطب کی بغاوت اور سطحی ذہنیت کا لحاظ کر کے گویا یہ کہہ دیا کہ اچھا کائنات حیاتی میں نہ سہی، کائنات طلسمی ہی کے نظام خلائی میں ایک ادنیٰ تصرف کر کے دکھا دے۔

فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ - پس جو کافر تھا وہ بہوت ہو گیا۔

اس کا جواب کسی شرک و آفتاب پرست کے پاس کیا ہو سکتا تھا۔ نہ اس وقت کسی سے جواب بن پڑا، نہ آج بھی کسی سے ممکن ہے۔ استدلال کا حاصل و خلاصہ یہ ہے کہ جس ہستی کے صاحب ارادہ عظیم ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ صاحب ارادہ خفیف بھی ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن کسی ”خدا“ کے عاجز و لا جواب رہ جانے کا منظر اس سے بڑھ کر کیا پیش



ہو سکتا تھا۔

آیت کا تو قرآن کے عمومی اسلوب بیان کے مطابق اللہ کے ایک عام قانون کے بیان پر مبنی ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

اور اللہ راہ ہدایت نہیں دکھاتا ظالم لوگوں کو اور ظالم لوگ کون ہوتے ہیں؟ وہی جو خلوتِ ذہن کے ساتھ حقائق پر غور نہیں کرتے اور حقیقتِ رسی کی کوشش ہی ذہنِ سلیم و مستقیم کے ساتھ نہیں کرتے۔ بلکہ عندِ غنا و تعلید جامد و تعصب پر جمے رہتے ہیں۔ چنانچہ اب ظالم و فاجر "خدا" باوجود لا جواب ہونے کے ایمان نہ لایا اور اپنی بات کی سچ پر قائم رہا۔

### —: ۳۰: —

ختم رکھنے سے کچھ قبل ایک حکایت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اور آئی ہے اور مشکلاتِ قرآن کے سلسلے میں سننے کے قابل ہے، ایک دن آپ کو خیال گزرا کہ حشر اجساد کیوں کروا رہا، مدتوں کے مرے اور گرے ہوئے لاشے آخر کس طرح جی اٹھیں گے۔ اور جب خیال آیا تو اپنے رب سے بھی سوال کر بیٹھے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ (آیت ۲۶۰)

(وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار (ذرا) مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح جلائے گا۔

سوال اس کا ہوا کہ کیا اس کا یقین نہیں؟

قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنِ ۖ (ارشاد ہوا کہ تمہیں اس کا یقین نہیں؟)

آپ تو خیر پیغمبر تھے یقین تو ہر عامی مومن کو ہوتا ہے، آپ کو کیسے نہ ہوتا! جواب میں



قَالَ بَلَىٰ وَ لَٰكِنْ لَّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي — عرض کیا کہ ضرور ہے لیکن یہ

درخواست اس لئے ہے کہ قلب کو (اور) اطمینان ہو جائے۔

یقین سے گزر کر درجہ اطمینان اور سکون کا حاصل کر لینا چاہتا ہوں اور علم یقین سے گزر کر مرتبہ عین یقین تک پہنچ جانا چاہتا ہوں یقین کا جو مرتبہ تصدیق و ایمان کے لئے کافی ہے، وہ تو حاصل ہی ہے، اب اور اس سے بڑھ کر درجہ اطمینان و مشاہدہ کی طلب محققین عارفین نے کہا ہے کہ مقبولین کے مشاہدات سے ترقی ہی ان کے مراتب ایمان و کمالات ایقان میں ہوتی رہتی ہے اور پھر اسی نسبت سے اضافہ ان کے تقرب، اعزاز، و قدر میں ہوتا رہتا ہے۔ — اشر کے ہونے والے غلیل میں طلب اور تڑپ اسی مرتبہ کی ہوتی تھی۔

قَالَ فَخَذُّ أَدْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصَرُّهُنَّ إِلَيْكَ —

ارشاد ہوا کہ اچھا چادر پرند سے لو اور انھیں اپنے سے خوب ہلا لو۔

آیت میں اہم ترین لفظ فَصَرُّهُنَّ إِلَيْكَ ہے، لغت میں صَادَ بَصُورًا مضموم اپنے سے خوب ہلا لینے اور مانوس کر لینے کا ہے اور اہل تفسیر نے یہاں اتنا مضمون مخذوف مانا ہے کہ اس کے بعد انھیں ذبح کر ڈالئے اور آپس میں اس کا گوشت ملا لیجئے۔ — شعر و محاضرات ادب بھی ایسے مخذوفات سے نا مانوس نہیں، اور قرآن خود بھی ایسے مخذوفات و مقدرات سے خالی نہیں۔ سورہ بقرہ کے ابتدائی ہی رکوعوں میں حضرت موسیٰ کو حکم ملا ہے کہ چٹان پر اپنا عصا مارو (فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ) اور پھر اس مضمون کو ظاہر کئے بغیر کہ آپ نے اس حکم کی تعمیل کی اور چٹان پر ضرب لگائی، یہ بیان آگیا ہے۔ بس چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے (فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَا عَشَرَ نَبِيعًا) اور ایسی مثالیں اور بھی بہت سی مل جاتی ہیں۔ بلکہ لغت و تفسیر کے بعض اماموں نے تو یہ صاف لکھ دیا ہے کہ صَادَ بَصُورًا کے معنی خود ہی کاٹنے اور پارہ پارہ



کر ڈالنے کے ہیں۔ کسی حدت و تقدیر کے ماننے کی ضرورت ہی نہیں۔ بہر حال حدت مانا جائے تو، اور نہ مانا جائے تو اتنے جزو پر جمہور مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں مراد یہی ہے کہ چاروں پہلے ہوئے پر ہندوں کو ذبح کر کے پارہ پارہ کر ڈالے۔ بعض مفسروں نے ان چاروں پر ہندوں کو متعین کر کے ان کے نام بھی لکھ دیئے ہیں۔ لیکن اول تو یہ روایت ہی کوئی مضبوط سند نہیں رکھتی۔ پھر اس تعین کی ضرورت ہی کیا ہے۔ البتہ بعض صوفیاء نے اس روایت سے خوب کام نکالا ہے۔ اور ایک بزرگ نے کہا ہے کہ ان چاروں پر ہندوں سے اشارہ ان کی چار قوتوں کی طرف نکلتا ہے۔ جو مشاہدہ حق اور حیاتِ حقانی سے مانع و حاجب ہوتے ہیں، اور جن کو قربان کئے بغیر انسان پاکیزگی کی منزل تک پہنچ نہیں سکتا۔ اور وہ چار نفسیاتی قوتیں یہ ہیں :-

(۱) خود بینی یا خود نمائی یا محبت جاہ

(۲) افراطِ شہوت جنسی

(۳) حرص و طمع یا محبت مال

(۴) طولِ آمل یا محبت دنیا

اچھا تو پر ہندوں کے اس گوشت کے مخلوط کو ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیجئے۔

ثُمَّ اجْعَلْ عَلَى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءً

پھر ان میں کا ایک ایک حصہ پہاڑ پر رکھ دو۔

جُزْءً کے مسئلے کو خوب سمجھ لیجئے۔ یہ مراد نہیں کہ چاروں کے مجموعہ کا ایک ایک

مسلم جزو یا ایک ایک پرندہ، بلکہ مجموعے یا مخلوط کے ملے جلے حصے۔

ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَا بُنَيَّ اسْعِيًّا

پھر انھیں بلاؤ تو وہ تمھاری طرف دوڑتے ہوئے پہلے آئیں گے۔

جب چند روز کے کھلانے پلانے اور اپنے سے ہلا لینے سے وہ اتنے مانوس



اور مطلع اپنے مجازی مالک کے ہو جاتے ہیں کہ اس کی ایک آواز پر دوڑے ہوئے  
اس کے پاس چلے آتے ہیں تو میری ہی پیدا کی ہوئی رو میں میرے بلاوسے پر  
کیسی بے چون و چرا اور کسی بے خطا میرے پاس بھاگتی ہوئی نہ آجائیں گی۔ اور اس  
کے ایک مشاہدے نے تمہارے دل کے اندر یہ حقیقت اتار دی ہوگی؟

وَاعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (آیت ۲۶۰)

اور اسے جانے رہو کہ اللہ نیر دست ہے اور حکمت والا۔

آیت کا خاتمہ حسب معمول اس انمول پند پر ہوا ہے کہ اسے خوب جانے

ہوئے رہو کہ اللہ تو ہر چیز پر یکساں غالب و قادر ہے و شوار اور محال اس کے

نزدیک کیا ہے۔ اشد و اہل اس کے لئے سب برابر۔ یہ تفریقیں تو انسان کے

اپنے معیار سے ہیں۔ اور باوجود اس عظم قدرت و اختیار مطلق کے وہ کرتا صرف

وہی ہے۔ جو عین اس کی حکمت و مصلحت کے مطابق ہوتا ہے۔

————— ﴿﴾ —————





## تیسرا خطبہ

سورہ آل عمران میں سیدہ حضرت مریمؑ کا قصہ ذرا تفصیل سے آتا ہے اور توجہ سے سننے والا ہے۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ  
مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ  
السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (آیت ۳۵)

وہ وقت یاد کر جب عمران کی بیوی نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں نے نذر مانی ہے اس (بچہ کے لئے جو میرے پیٹ میں ہے) آزاد رکھا جائے گا سو تو مجھ سے قبول کر تو خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔

عمران کے نام کی تاریخی شخصیتیں دو گنہاری ہیں۔ ایک حضرت موسیٰؑ کے والد ماجد عمران بن صہر، اور دوسرے ان سے صدیوں بعد حضرت مریمؑ کے والد ماجد حضرت عیسیٰؑ کے نانا۔ عمران بن ماثان۔ سیاق میں یہی مراد ہیں۔ (امراۃ عمران یعنی انکی بیوی، ان کا نام سچی نوشتوں میں حنہ (Hannah) آیا ہے اور ہمارے مفسرین نے لکھا ہے کہ شام وغیرہ میں سچی کلیسا، کلیسائے حنہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور ان کی قبر شہر دمشق میں ہے۔



مُحَرَّرًا یعنی ہر قسم کے دنیوی علائق سے آزاد رہے گا۔ اور تیری ہی خدمت اور چاکری کے لیے وقف رہے گا۔

جب سے آپ عالم تھیں اور امید فرزندِ زمینہ کی کر رہی تھیں تو آپ نے اس وقت یہ مناجات حق تعالیٰ سے کی تھی۔ میکیل سلیمانی (بیت المقدس) کی خدمت کے لیے اولاد ذکر کرنے کا دستور اس وقت تھا۔ اور والدہ مریم نے اس دستور کے مطابق یمنت مان لی تھی۔ اس دعا سے متعلق اور بھی تفصیلات قدیم ترین مسیحی نوشتوں میں موجود تھیں لیکن جب آباء کے کلیسا نے کات چھانٹ کر کے "مستند" انجیلیں مرتب کرنا شروع کیں تو انھوں نے ایسے بہت سے بیانات کو حذف کر کے اپنی مستند کتابوں سے خارج کر دیا۔ اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے مسیحی فاضل کہہ رہے ہیں۔ مثلاً کیتھولک ڈکشنری میں صفحہ ۴ پر اور ہسٹنگز کی ڈکشنری آف جی بائبل جلد ۲ کے صفحہ ۲۸۸ پر۔

دُعا کے آخر میں ہے کہ تو تو خوب سننے والا میری دعاؤں کا اور جاننے والا میری آرزوؤں کا ہے۔

لیکن ولادت جب ہوئی تو غلات توقع بجائے لڑکے کے لڑکی کی، تو اب وہ بچاری چکر میں پڑ گئیں کہ اب کیا صورت نذر پوری کرنے اور منت اُتارنے کی ہو سکتی ہے۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی ۝

پھر جب وہ لڑکی جنی تو یہ بولیں کہ اے میرے پروردگار میں نے تو لڑکی جنی۔ تو اے اشر میرے۔ اب کیا کروں اور اپنی نذر کیسے پوری کروں۔

اب اشر میاں کے دورانِ کاہنِ نبی جتہ سے فرماتے ہیں:

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۚ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی ۝

اور اشر تو ان سے بڑھ کر جانتا تھا کہ انھوں نے کیا جنا ہے، اور لڑکا



لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتا تھا۔

یعنی اللہ نے تو خوب سمجھنے کے بعد ہی لڑکی عطا کی تھی۔ اور ماں غریب کو کیا خبر ہو سکتی تھی کہ یہ لڑکی کس عظمت و منزلت کی ہو گی۔ اور پھر اس کے بطن سے پیدا ہونے پر کس فخر و تہنیت کی ہو گی۔

اس جملہ معترضہ کے بعد اب اس دعا کا بقیہ سنئے :-

وَإِنِّي مَسْمِيْنَهَا مَرْيَمَ وَرَافِيْ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا  
مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ۝ (آیت ۳۶)

خیر میں نے تو اس کا نام مریم رکھ لیا ہے، اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو  
تیری پناہ میں شیطانِ رجیم سے دے رہی ہوں۔

مریم نام یہود میں چلا ہوا تھا۔ اور اس کے لفظی معنی سریانی زبان میں بلند کے  
ہیں۔ (اقریب الموارد)

الفاظ دعا سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اللہ والیوں کو کتنی فکر اپنی اولاد کے دینی و  
اخلاقی تحفظ کی ہوتی ہے۔ اب قصہ اس کے بعد کا ملاحظہ ہو۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا  
وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ط

پھر ان کے پروردگار نے ان کو بوجہ احسن قبول کر لیا اور اس کو اچھا  
نشوونما دیا اور اس کا سر پرست زکریا کو بنا دیا۔

یعنی اللہ نے والدہ مریم کی نذر کو لڑکی کی شکل میں قبول کر لیا۔ اور یہ خدمت  
ہیکل سلیمان کی ساری تاریخ میں ایک نئی بات ہوئی۔ مسیحی نوشتوں کے بموجب حضرت  
مریم تین سال کی عمر میں ہیکل کی خادمہ کی حیثیت سے چُن لی گئیں اور بعد کے چھوٹے  
بڑے سب خادم اس گھس بچھی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔



اور آپ کا نشوونما کیا جسمانی اور کیا اخلاقی و روحانی اعتبار سے ہوتا رہا یہاں تک کہ آپ بالغ اور سیانی ہو گئیں۔

کَقَالَهَا ذَكَرِيَّا سَے اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ یہ سارے انتظامات خدائی تھے، ذکر یا کی حیثیت صرف واسطہ کی تھی۔ حضرت ذکر یا اسلامی عقیدہ میں اللہ کے پیغمبر تھے۔ مسیحی نوشتوں میں ذکر والدہ مریم کا تو پھر آیا ہے مگر حضرت ذکر یا کے ذکر سے مسیحی صحیفے تقریباً خائوش ہی ہیں۔ چاروں سنت انجیلوں میں نام صرف ایک بار آیا ہے۔ انجیل لوقا میں وہ بھی پیمبر کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف ایک بزرگ اور راست باز کا بن کی حیثیت سے۔

”یہودیہ کے بادشاہ ہیرودس کے زمانہ میں ایساہ کے فریق میں ذکر یا نام

ایک کاہن کا تھا“ ر لوقا - ۱ : ۵

آپ رشتے میں حضرت مریم کی والدہ کے ہنوئی تھے۔ یعنی ان کی والدہ کی ہیں کے شوہر حضرت اہم کے والد جناب عمران کی وفات ان کے بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ اور ان کی وفات کے بعد ہیکل کے خادموں یا مجادروں کی سرکاری انھیں حضرت ذکر یا کے حصہ میں آئی تھی حضرت مریم کی تربیت کا واسطہ بھی اللہ نے آپ ہی کو بنایا۔ حضرت یحییٰ آپ ہی کے فرزند تھے۔ جو حضرت عیسیٰ کے ہم سن تھے۔ آپ کی تاریخ وفات کہیں نظر سے نہیں گزری۔ آپ کے زمانہ کا بس اندازہ ہی ان حسابوں سے کیا جاسکتا ہے۔

حضرت سلیمان ہی کی طرح حضرت مریم اور حضرت ذکر یا بھی ایسی شخصیتیں ہیں جن کی عظمت و شرف قائم رکھنے کا اہتمام قرآن ہی نے اسرائیلی تاریخ اور مسیحی نوشتوں اور عقیدوں سے کہیں زیادہ کیا ہے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ

عِنْدَهَا رِزْقًا



جب جب ذکر یا ان کے پاس حجرے میں آتے تو ان کے پاس کوئی چیز کھانے پینے کی پاتے۔

محراب عربی میں، اُردو کی محراب سے الگ، حجرے کو کہتے ہیں۔ جہاں کوئی رب کے الگ تھلاک ہو کر بیٹھے اور ہیکل سلیمانی کے خادموں کے رہنے اور عبادت کرنے کے لئے ہیکل کے ادھر ادھر زاویے اور حجرے بنے ہوئے تھے۔ انہیں میں سے ایک حجرہ حضرت نبی مریم کا تھا۔ حضرت ذکر یا یوں بھی سرواڑ خدام تھے۔ اور ہر خادم کی نگرانی آپ کے فرائض میں شامل، اور آپ پھر اس نو عمر خادمہ کے تو عزیز قریب اور بزرگ سرپرست بھی تھے۔ حجرہ مریم میں قدر شا آپ کی آمد و رفت رہا کرتی۔ کُلَّمَا قرآن مجید کے اس ذرا سے لفظ نے اس سارے مفہوم یعنی آپ کی کثرت آمد و رفت، اور وقت بے وقت اکھٹا سب کی طرف اشارہ کر دیا۔ رِذْقًا سے مراد کھانے پینے کا سامان ہے۔ مثلاً تازہ پھل اور میوے۔ اور امام رازی نے لکھا ہے کہ لفظ کی توحین سے تعظیم نکلتی ہے، یعنی وہ رزق جو کوئی عجیب و غریب پہلو رکھتا تھا۔ بعض قدیم جدت پسندوں نے رزق کو استعارہ قرار دے کر اس سے مراد فیض کی ہے۔ اس پر ابو جہان غرناطی صاحب البحر المحیط نے لکھا ہے کہ یہ تفسیر کے حدود سے تجاوز کر کے باطنیہ کی زبان اختیار کر لینا ہے۔

یہ طور حوالہ معترضہ بھی سن کر کہنے کی بجائے کہ نبی نہ تھیں، محض ولی تھیں، جسے امامیہ کو بھی اہل سنت کے ساتھ اتفاق ہے۔ اس لئے اس آیت سے محققین نے اثبات کرامت و خرق عادت پر استناد کیا ہے۔ حضرت ذکر یا کو اس پر حیرت سے بڑا بالکل قدرتی تھی اور پیغمبر تک کے لئے ضروری نہیں کہ ہر معاملہ میں اپنی نظر کو اسباب ظاہر کے باہر دوڑائے۔

آپ حیرت سے سوال کر بیٹھے۔



قَالَ يَمْرُؤُكُمْ أَفَىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ

”پوچھ بیٹھے کہ اسے مریم یہ (سب) تجھے کہاں سے مل جاتا ہے؟“

لاتا تو میں ہی لاتا۔ میرے سوا کون یہ چیزیں پہنچا دیتا ہے؟

قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ

بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (آیت ۳۷)

بولیں کہ یہ اللہ کی طرف سے (آجاتے ہیں) اور بیشک اللہ جس کو چاہے

اسے رزق بے حساب دے دیتا ہے۔

عارفہ کی نظر اسباب پر نہیں، سبب الاسباب پر تھی۔ اس نے وہی جواب میں کہہ

دیا اور اس پر اضافہ بھی اس نکتہ عارفانہ کا کر دیا کہ اللہ کی مشیت کسی واسطہ اور کسی

حق و استحقاق کے ساتھ مقید نہیں۔ وہ جب کسی کو دینے پر آئے تو بلا واسطہ اسباب

بھی دے سکتا ہے اور بلا استحقاق بھی۔

ضمناً اس میں ردِ مکمل آیا ان مشرک قوموں کا جنہوں نے خوش حالی اور تنگ حالی کو

لازمی نتیجہ قرار دیا ہے پچھلے جنم کے اعمال کا۔ اسلام کا خدا جس طرح اپنی مشیت کو سنی کے

ہر جزو میں آزاد ہے۔ اسی طرح تقسیم رزق میں بھی۔

آگے سنئے :-

هٰذَا لَكَ دَعَا ذَكَرْتَ رَبَّهٗ ۝

بس وہیں ذکر یا اپنے رب سے دعا کرنے لگے۔

قدرت و رحمت الہی کے تازہ کوشموں سے حضرت زکریا کا ساثر قدرت تھا۔

هٰذَا ظَرْفُ مَكَانٍ، ظرفِ زمان کے معنی میں آیا ہے۔ اس لئے دوسرا ترجمہ بجائے ”وہیں“

کے ”معا“ بھی ہو سکتا ہے۔ غرض جوں ہی آپ پر منکشف ہوا کہ یہ مقام قبولیت کا، اور

خرقِ عادت کے صدور کا ہے، آپ خود بھی بصرِ وحی دعا ہو گئے۔



قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً  
إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ (آیت ۳۸)

عرض کی کہ اے میرے پروردگار اپنے پاس سے ایک پاکیزہ اولاد دے  
بے شک تو دعا کا بڑا سننے والا ہے۔

ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً یعنی اولاد پاکیزہ جو میرے سلسلہ روحانی کو آگے چلا سکے۔  
مجھے بھی اولاد صالح اسی طرح عنایت ہو جس طرح والدہ مریم کو مریم عنایت ہو چکی ہیں،  
حضرت زکریا کبر سنی کو پہنچ چکے تھے، اور بیوی صاحبہ بھی عقیقہ یا بانجھ سمجھ لی گئی تھیں۔  
ایک خارق عادت واقعہ کو دیکھ، آپ کا ذہن قدرتا اس طرف منتقل ہوا کہ جو خدا اس پر  
قادر ہے کہ بلا اسباب ظاہری تو تادمہ پھل پھلا رہی پہنچا دے، وہ یقیناً اس پر بھی قادر ہے  
کہ اس سن میں مجھے نعمت اولاد دے سرسرا کر دے۔

مِنْ لَدُنْكَ یہ جزا سے صاف کر رہا ہے کہ دعا مانگنے والے کی نظر اس  
دنیا میں بھی اسباب سے بڑھ کر خالق اسباب پر ہے۔

قدرتا اولاد کی خواہش امر طبعی ہے اور زہد کیا معنی کمال زہد کے بھی منافی نہیں۔  
قرآن مجید نے اس قسم کی دعائیں پیغمبروں کی زبان سے ادا کرا کے یہ بتا دیا کہ جن مذہبوں  
بیوی بچوں کو مطلق صورت میں جنجال قرار دیا ہے، وہ حقیقت سے کس قدر دور ہیں طلب  
اولاد کی دعا تو سنت اسباب و صدقین ہے، اور صحیح بخاری میں ایک مستقل باب طلب  
اولاد کے فضائل میں ہے۔

ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً کے اضافہ سے صاف کر دیا کہ اہل اللہ کی نظر آخرت پر  
بہر حال رہتی ہے۔ کوئی مضائقہ اولاد کی مطلق خواہش میں بھی نہ تھا، لیکن حضرت زکریا  
اپنے لئے محض اولاد ہی نہیں چاہتے، اولاد طیب و پاکیزہ چاہتے ہیں جو ان کے بعد  
دین حق کی تبلیغ کا مشن جاری رکھے۔ اللہ والوں کی نگاہ میں اخلاقی و روحانی



فضائل بہر حال مقدم رہتے ہیں۔ انجیل میں بیجاے اس دلائل، مؤثر، روح پرور تفصیل کے قناعت صرف اس خشک مختصر واقعاتی بیان پر کی گئی ہے

”ذکر یا نام کا ایک کاہن تھا، اور اس کی بیوی ہاردن کی اولاد میرا  
سے تھی اور اس کا نام ایشیع تھا اور ان کے اولاد نہ تھی، اس لئے  
کہ ایشیع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے“ (لوقا۔ ۱: ۵-۷)

إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الدُّعَاءِ تو دعاؤں کا بڑا سننے والا اور بڑا قبول کرنے والا ہے۔ حق تعالیٰ کی اس صفت کو بار بار بیان میں لانا ان مادی اور نیچری حقیقت والوں کے رد میں ہے، جو واقعات کو تمام تر اسباب ظاہری و مادی ہی کا نتیجہ سمجھتے اور ارادہ حق تعالیٰ کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتے۔ دعا مطلقاً قبول ہو گئی اور حالت نماز ہی میں فرزند کی بشارت مل گئی۔

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي  
الْمِحْرَابِ ۚ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بَيَحْيَىٰ (آیت ۳۹)

انہیں فرشتوں نے آواز دی اور وہ ابھی نماز حجرہ میں کھڑے ہوئے پڑھ رہے تھے کہ انہیں کہہ دیا کہ یحییٰ کو خوشخبری دیتا ہے۔

الْمَلَائِكَةُ کا صیغہ جمع کھٹک نہ پیدا کرے۔ یہ لازمی نہیں کہ آواز دینے والے فرشتے متعدد ہوں۔ عربی میں صیغہ جمع اسم جنس کا بھی کام دیتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ملائکہ سے مراد صرف جنس ملائکہ ہی ہوا اور عربی میں نہ محاورہ عام ہے۔ فَلَانَ بِرُكْبِ الْخَيْلِ (فلاں شخص گھوڑوں پر سوار ہوتا ہے) حالانکہ وہاں مراد گھوڑے کی جنس ہوتی ہے نہ کہ ان کا تعدد۔

يَحْيَىٰ۔ فرزند کی صرف بشارت ہی نہیں ملی، بلکہ نام بھی عطا ہو گیا۔ انجیل میں تلفظ یوحنا آیا ہے۔ اس خاص موقع پر عبارت ہے :-



”فرشتے نے اس سے کہا اے ذکر یا خوف نہ کر، کیونکہ تیری دعا سنی گئی۔

اور تیری یہی اتباع تیرے لئے بیٹا بنے گی، اس کا نام یوحنا رکھنا، اور سنئے

خوشی و خرمی ہوگی“ (لوقا۔ ۱: ۱۴)

یہ حضرت عیسیٰ کے خالہ زاد بھائی تھے اور حسب روایت انجیل، ان سے سن میں عمر

چھ مہینے بڑے، ۳۰ء میں حاکم شام فلسطین ہیرود کے حکم سے شہید کر دئے گئے۔

یحییٰ کا صرف نام ہی نہیں عنایت ہوا۔ بلکہ کچھ اوصاف کی بھی پیش خبری دی گئی۔

مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَحَصُودًا

وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (آیت ۳۵)

کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور مقتدا اور بڑے نفس کے ضبط

کرنے والے اور بنی صالحین میں سے۔

ان الفاظ کو خوب سمجھ لیجئے۔ جس طرح روح القدس ایک لقب حضرت جبریل کا ہے

كَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ سے مراد حضرت مسیح ہیں۔ ابن عباس صحابی اور متعدد جلیل القدر

تابعین سے یہی منقول ہے۔ یعنی تصدیق حضرت عیسیٰ کی کرنے والے۔ اور سچی عقیدہ میں

حضرت یحییٰ کی اصل حیثیت مسیح کے نقیب ہی کی ہے۔

سَيِّدًا یعنی دین کے باب میں مقتدا اور پیشوا۔ عیسائی تو خیر آپ کی بزرگی کے

قائل ہی ہیں۔ یہودی بھی باوجود آپ سے بدعقیدگی اور دشمنی کے، آپ کی مرجعیت اور

مقبولیت کے منکر نہیں۔

حَصُودًا یعنی اسے اپنے شہوات اور جذبات پر قابو حاصل ہوگا اور وہ نہایت

درجہ محتاط و متقی ہوگا۔ انجیل میں آپ کے زہد و عفاف کا ذکر مختلف موقعوں پر صراحت و

تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً

”خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا، ہرگز نہ وہ مے اور نہ کوئی اور شراب



پئے گا۔ اور اپنی ماں کے پست ہی سے وہ روح القدس سے بھر جائے گا (لوقا۔ ۱۶) اور اسی انجیل لوقا میں آگے چل کر ہے :-

”اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو ان کا خدا ہے پھیرے گا اور وہ ایلیاہ کی روح اور قوت میں اس کے آگے چلے گا کہ والدین کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راست بازوں کی دانمانی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لیے ایک مستعد قوم تیار کرے۔“ (لوقا۔ ۱: ۱۷، ۱۸)

اور پراسی لوقا میں ہے :

”اور وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا، اور اسرائیل پر ظاہر ہونے تک جنگلوں میں رہا۔“ (لوقا۔ ۱: ۸)

نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ یہ ذرا سافقرہ دو چیزوں کا اثبات کرتا ہے : ایک آپ کی نبوت کا، یہ رد ہے یہود کا جو آپ کو بجائے نبی کے ایک بنا ہوا انقلابی سمجھتے تھے۔ دوسرا آپ کی صابحت کا اثبات، نصرائیوں کے مقابلہ میں ہے۔ صابحت تو نبوت سے ملکی اور پست چیز ہے۔ اور جب کوئی نبی ہے تو آپ کہیں گے کہ ظاہر ہے کہ وہ صالح تو ہو گا ہی۔ لیکن یہ ظاہر کہاں ہے ؟ یہ تو صرف اسلام کی تعلیم ہے، اسلام ہی نے آکر یہ سبق سکھایا، ورنہ اہل کتاب کے ہاں تو تقویٰ لازمہ نبوت تھا ہی نہیں۔ اور نبی کوئی غیر صالح بھی ہو سکتا تھا۔ حضرت زکریا کو بشارت تو بیٹے کی مل گئی اور اپنی دعا کی بھرپور مقبولیت پر آپ کو جیسی مسرت ہوئی ہو گی ظاہر ہے، پھر بھی آپ بشر ہی تھے اور بشریت کے تقاضے سے حسرت میں بھی تھے کہ قدرت کے معمولات عام سے اس قدر ہٹ کر کوئی واقعہ واقع ہو گا کیونکر۔ یہ شبہ بھی بے تکلف جناب باری میں پیش کر دیا۔

قَالَ دَبِّ اَنِّیْ یَكُوْنُ لِیْ غُلَمٌ وَقَدْ بَلَغَنِی الْكِبَرُ  
وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ



عرض کی کہ اے میرے پروردگار میرے بیٹے کس طرح ہوگا۔ اس حال

میں کہ مجھے کبر سنی نے آیا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔

آیت یہ تعلیم بھی دے رہی ہے کہ خلافت اسبابِ مادی کسی شے کی خبر وقوع پر

حیرت جس طرح ہر بشر کے لئے ایک امر طبعی ہے، خود پیر بھی امور طبعی میں بالکل بشری ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے بھی بالکل جائز ہے۔

جواب میں ارشاد ہوا۔

قَالَ كَذَلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۝

اللہ اسی طرح کر دیتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے۔

رفع استبعاد کے لئے بس استحضار قدرتِ الہی کا یہ مراقبہ بالکل کافی ہے اور سمجھ کر

اس استحضار کے لئے ایک اشارہ کافی ہو گیا۔ اب عرض کی کہ اس کے لئے کوئی خاص نشان بھی ارشاد ہو جائے۔

قَالَ حَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۝ (آیت ۴۱)

بولے اے پروردگار میرے لئے کوئی نشان مقرر کر دے۔

یعنی کوئی ایسی علامت اعجازی رنگ میں ظاہر ہو جائے جس سے متعین طور پر مجھے

یقین ہو جائے کہ محل قرار پا گیا اور زمانہ ولادت اب قریب ہے۔

قَالَ اَيْنُكَ اَلَا نُكَلِّمُ النَّاسَ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمَزًا ۝

وَ اذْكُرْ رَبَّكَ كَثِيرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝ (آیت ۴۲)

ارشاد ہوا کہ نشانی تمہارے لئے یہ ہے کہ تم بات چیت تو نہ کر سکو گے لوگوں سے

تین دن تک بجز اشارات کے، باقی اپنے پروردگار کو بہ کثرت یاد کرتے

رہو اور اس کی تسبیح بھی دن میں بھی اور شام میں بھی۔

یعنی وہ نشانی یہ ہے کہ تین دن تک تم لوگوں سے بات چیت تو نہ کر سکو گے باقی اپنے پروردگار



کی یاد خوب کرتے رہو۔ اور اسکی تسبیح بھی سرج و شام کرتے رہو۔ اور محاورہ زبان میں اسکی انھیں دو وقتوں کی تعیین اور حصر مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ دوام ذکر و تسبیح ہی مراد ہوتا ہے۔ قرآن مجید جو تمام آسمانی صحیفوں پر ہمیں یعنی نگران و نگہبان ہے۔ اسکا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ ان تالیفوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرتا جائے۔ اس نے اپنا فرض یہاں بھی انجام دیا۔ ورنہ انھیل کے بیان سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بڑی لغزش و محضیت حضرت زکریا سے سرزد ہو گئی تھی۔ اور اس کی سزایہ ٹی تھی کہ چند روز کے لئے آپ کی قوت گویائی سلب کر لی گئی تھی۔ چنانچہ انھیل کی عبارت اس موقع پر ہے :-

”اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہوئیں تو چپکایہے گا اور بول نہ سکے گا

اس لئے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہموں گی یقین نہ کیا۔

جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس انھوں نے معلوم کر لیا کہ اس نے

مقدس رو بار دیکھا ہے اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا اور گونگانا رہا (لوقا۔ ۱۱)

غرض یہ کہ یہ تین دن کی خاموشی بہ طور سزا یا عذاب کے تھی۔ ہرگز صحیح نہیں۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ بلکہ گفتگو اس میں البتہ حل سکتی ہے کہ یہ سہ روزہ خاموشی آیات مقررہ منظراری تھی یا اختیاری۔ یہ مجبور مفسرین کے اتباع میں ہے جو کہ آیت کے ترجمہ میں ابھی یہ غرض کیا گیا ہے کہ تم لوگوں سے بات نہ کر سکو گے، ورنہ الفاظ الَّا تَكَلَّمُ النَّاسُ کا صاف سیدھا اور بے تکلف ترجمہ تو یہ ہے کہ تم لوگوں سے بات نہ کرو گے (نہ کر سکو گے) مفسرین میں خال خال کوئی اس طرف بھی گیا ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں اس کو بوسلم معتزلی کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور خود اس کی کوئی تردید نہیں کی ہے۔

گویا حکم الہی یہ مل رہا ہے کہ ذکر یا تم تین دن تک گفتگو میں زبان بند رکھنا۔ ہاں ذکر الہی و تسبیح کثرت سے کئے جانا الَّا تَكَلَّمُ النَّاسُ میں الناس گویا فقرے کی جان ہے۔ یعنی خلق پر گفتگو کی قدرت نہ رہے۔ باقی ذکر الہی کے لئے زبان بدستور چلتی رہے گی۔



— (۳۲) —

حضرت زکریا کا تذکرہ درمیان میں آجانے کے بعد اب پھر ذکر مریم شروع ہوتا ہے

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ

وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰٓى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ ؕ (آیت ۳۲)

اور وہ وقت یاد کرو جب فرشتوں نے کہا کہ اسے مریم اللہ نے آپ کو برگزیدہ

کیا ہے اور پاک کیا ہے اور آپ کو دنیا جہاں کے مقابل میں برگزیدہ کیا ہے

مَلٰٓئِكَةُ کے صیغہ جمع سے، بیسیاں لگی چند منٹ عرض کیا جا چکا ہے یہ لازم

نہیں آتا کہ کہنے والے کئی فرشتے ہوں، صیغہ جمع اسم ضمیں کے موقع پر بھی بولا جاتا ہے۔ یہی

فرشتوں کی ہم کلامی کسی غیر بنی سے، نو وہ تو ثابت اس آیت سے ہو جاتی ہے البتہ محققین

نے لکھا ہے کہ فرشتے کا اللہ کی طرف سے پیام تبلیغ عرمت بنی کے ساتھ مخصوص ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ اس اصطفا کا تعلق مریم کے بچپن سے ہے۔ یعنی اللہ

نے برگزیدگی تو آپ کو شروع ہی سے دے رکھی ہے۔ آپ وجود میں آئیں تو اپنی

والدہ کی مقبول دعاؤں کے اثر سے۔ پھر آپ سے کام سیکل کی خدمت کا لیا گیا۔ جو

اب تک مخصوص رہا تھا مردوں اور لڑکوں کے ساتھ، اور آپ کو آپ کے حجرے میں

غذا میں جس عجازی رنگ میں پہنچائی گئیں اس نے زکریا یا یحییٰ تک کو متخیر کر دیا۔ یہ سب

شالیں آپ کی مقبولیت ہی کی تو ہیں۔

وَطَهَّرَكِ یعنی اللہ نے آپ کو بنی نہ ہونے کے باوجود گناہوں کی آلائش سے

پاک کر دیا ہے اور آپ کو اخلاقی پاکیزگی کا ایک نمونہ بنا دیا ہے۔ یہ سب رو

میں ہے یہود کے جو گندے الزامات آپ پر لگانے سے مرتکب ہوئے تھے۔

وَاصْطَفٰكِ عَلٰٓى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ ؕ اس دوسرے اصطفا کا تعلق



آپ کے بلوغ کے بعد سے ہے۔ اور پیدائش کے بعد یہ دوسری برگزیدگی خاص خاص حیثیتوں سے ہے۔

اور ان آیتوں کے بعد پھر وہی مضمون شروع ہوتا ہے :

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَأِكَةُ يَمْرُؤُا إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ  
بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ  
مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ (آیت ۴۵)

اور وہ وقت یاد کرو جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ آپ کو خوشخبری دیتا ہے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی۔ ان کا نام و لقب مسیح ابن مریم ہوگا۔ دنیا اور آخرت میں مقربوں میں سے۔

مسیح پیمبر کے ذکر میں یہود و عیسائیوں دونوں کے آدس خوبی کے ساتھ ساتھ نکلتے آتے ہیں۔ ابن مریم کہہ کر قرآن مجید نے یہ حقیقت بیان کر دی کہ حضرت عیسیٰ خود تو بشر تھے ہی۔ فرزند بھی کسی دیوی دیوتا، کسی مافوق البشر کے نہ تھے، محض ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ اور اس ابن مریم سے اشارہ اس طرف ہو گیا کہ دنیا کے عام دستور کے خلاف حضرت عیسیٰ کا انتساب بجائے باپ کے ماں کی جانب ہو گیا۔ اور اس سے کچھ نہ کچھ روشنی آپ کی خرق عادت ولادت پر بھی پڑ گئی۔

وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ، یہ بات یہود کے رد میں ہے کہ تم نے جس کے حق میں ہر طرح کی توہین روار کھی ہے وہ کتنی عزت و اکرام والا ہے۔ دنیا کا اعزاز اس سے ظاہر ہے کہ عیسائیوں کے خالیا نہ عقیدے کو چھوڑ کر خود مسلمان جو دنیا میں ۱۴۰۰ کو کی تعداد میں ہیں ان کو اپنا ایک سردار اور اللہ کا پیغمبر برحق مان رہے ہیں اور ان کا نام بغیر علیہ السلام کے نہیں لیتے اور خود یہ بھی کچھ کم نہیں کہ اب یہود تک کے لہجہ میں نرمی آگئی ہے۔ اور صدیوں کی عداوت و عناد کے بعد اب کسی درجہ میں ان کے احوال اکرام کا اثر



انہیں بھی کرنا پڑ گیا ہے۔

مِنَ الْمُقَرَّبِينَ۔ ایک لفظ میں یہود اور نصراہوں دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔  
 پہلا رد نصراہیت کا یعنی وہ اللہ کے مقرب اور برگزیدہ بندے ہیں نہ کہ خود بنا۔  
 دوسرا رد یہود کا کہ وہ کوئی شعبہ و باز یا ساحر نہ تھے۔ مِّنَ الْمُقَرَّبِينَ کی ترکیب یہ ظاہر  
 کیے دیتی ہے کہ وہ مقبولیت میں شرف و نہیں بلکہ ایک جماعت ان کے شریک ہے۔  
 وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ (آیت ۴۶)  
 اور گفتگو کریں گے لوگوں سے گوار سے میں بھی اور پختہ عمر میں بھی اور صالحین  
 میں سے ہوں گے۔

فِي الْمَهْدِ مراد کم عمری کا مین ہے، مفسرین نے آپ کے بچپن کا زمانہ مراد لیا ہے۔  
 بچپن ہی سے آپ کی باتیں قصہ کہانی کی نہیں بلکہ حکمت دینی و روحانی کی ہوتی تھیں انجیل  
 و تورات کے باب ۴ میں متعدد قرآنی حکمت و دانائی کے آپ کی زبان سے نکلے ہوئے صحیح اردو  
 ہیں۔ جو آپ سے بارہ سال کی عمر میں صادر ہوئے تھے۔ اور کہلا سے مراد ہے پختہ عمری۔  
 یعنی نوجوانی کے بعد اور بڑھاپے سے قبل کا مین۔ مثلاً تیس سال سے لے کر پچاس سال کی  
 عمر۔ مقصد یہ ہے کہ آپ میں جوش تبلیغ شروع سے آخر تک برابر بھرا رہا۔ اور عمر کے گزرنے  
 کے ذکر میں اشارہ آپ کی الہیت کی رد کا بھی نکل آیا۔ یعنی آپ کا جسمانی نشوونما اسی طرح ہوتا  
 رہا۔ جیسے ہر انسان کا ہوتا ہے۔

وَمِنَ الصَّالِحِينَ جب آپ ہمیشہ تھے تو اسلامی لفظ کے معنی ہوتے ہیں۔  
 صالح کیسے نہ ہوتے۔ لیکن قرآن کا مقصود یہاں بھی اپنے معمول کے مطابق یہودیت اور  
 نصراہیت کا دوطرفہ رد رکھا ہے۔ یہود کو اس نے یہ بتایا کہ آپ نعوذ باللہ شعبہ و باز  
 یا ساحر نہ تھے، جیسا کہ انہوں نے افتراء کر رکھا ہے۔ اور دوسری طرف نصراہیوں کو یہ بتایا  
 ہے کہ وہ یہود یا نیم یہود نہ تھے۔



آپ بہر حال دوسرے انبیاء صالحین کی طرح بشر تھے نہ کہ فوق البشر اور بتا۔  
جب فرشتہ کی یہ صدا اُسے غیبِ حضرت مریم کے کان میں پڑی تو آپ نے حیرت  
کے ساتھ اپنے پروردگار سے مناجات کی :-

قَالَتْ رَبِّ اَنْیَ یَکُونُ لِیْ وَکَدْ وَلَمْ یَمَسِّنِیْ بَشْرًا  
بولیں اے میرے پروردگار میرے اولاد کس طرح ہوگی دریاں مالیکہ مجھے کسی  
مرد نے (بغرض مواصلت) اتحاد تک نہیں لگایا ہے۔

حسب روایت انجیل حضرت مریم کی رخصتی ابھی نہیں ہوئی تھی اور قبل رخصتی خلوت  
یہود کے قانونِ مروج میں بالکل ممنوع تھی۔

قَالَتْ رَبِّ "دَب" بہ ظاہر بالکل معمولی اور ناقابل التفات سلفظ ہے لیکن  
انجیل میں یہی مقام کھولی کر دیکھ لیجئے، لکھا ہے کہ :

"ہم نے فرشتہ سے کہا" (لوقا۔ ۱ : ۳۴) اس ذرا سے فرق سے واضح  
ہو جاتا ہے کہ قرآن نے آپ کا مرتبہ معرفتِ توحید کس درجہ اونچا کر دیا ہے !  
اَنْیَ یَکُونُ لِیْ وَکَدْ"۔ سوال ظاہر ہے کہ واقعہ کی حسرتِ انگریزی اور  
غریب کی بنا پر تمھارے کسی شک و انکار کی بنا پر۔

فرشتہ سے یہ دو پہ دو گفتگو سن لینے کے بعد انکار کا کوئی محل ہی باقی نہیں رہا  
تھلا۔ استبعادِ البتہ باقی تھا، جو لازمہ بشریت تھا۔ اور حضرت زکریا کی جو حکایت بشار  
فرزند کے وقت کی بیان ہو چکی۔ اس سے یہ حکایت کتنی ملتی ہوئی ہے  
جواب بھی اسی رنگ کا ارشاد ہوا۔

قَالَ کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُؕ اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا  
یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فِیْکُوْنُ ؕ (آیت ۴)

فرمایا ایسے ہی اللہ پیدا کر دیتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے، وہ جب کسی بات کو



پورا کرنا چاہتا ہے تو بس اس سے کہتا ہے ہو جاؤ۔ بس اور وہ ہو جاتی ہے۔  
رفع استبعاد کے لئے حضرت مریم کو یاد دلایا گیا کہ فاعل حقیقی تو ہماری مشیت اور ہمارا  
امادہ ہے، نہ کہ اسباب طبعی و مادی و عادی، کہ وہ تو سب کے سب بس درجہ واسطہ و وسیلہ  
میں ہیں۔ تو نظر صرف ہم ہی پر رکھو۔

یاد کر لیجئے کہ ایسے ہی موقع پر حضرت زکریا سے جو فرمایا گیا تھا۔ اس کے الفاظ تھے۔  
كَذَٰلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ، وہاں يَفْعَلُ اور یہاں يَخْلُقُ کا استعمال کیا مجھضاً اتفاقی  
ہے؟ جواب میں دو بار ایک میں مفسروں، ایک ابو حیان غرناطی صاحب البحر المحیط اور دوسرے  
صاحب روح المعانی آلوسی بغدادی نے لکھا ہے کہ حضرت زکریا کی اولاد کے معاملہ میں معاملہ  
کچھ ایسا غیر معمولی نہیں ہو رہا تھا۔ ولادت عام سنت الہی کے مطابق، یعنی مرد و زن کے  
اتصال سے ہو رہی تھی۔ دونوں صرف سن سے اترے ہوئے تھے۔ اس ندرت کے  
اظہار کے لئے يَفْعَلُ بالکل کافی ہو گیا۔ یہاں حضرت مریم کے معاملہ میں عام و جاری سنت  
الہی سے ہٹ کر بغیر مرد و عورت کے اتصال کے صرف عورت ہی سے ولادت کا تحقق  
کرانا تھا۔ اس لئے یہاں اس کی صفت تخلیق لائی گئی، جو اللہ کی قدرت ایجاد و ابداع پر صاف  
دلالت کر رہی ہے۔

اور انھیں مطالب کو شیخ رشید رضا مصری صاحب المنار نے اور زیادہ بسط و تفصیل سے  
بیان کیا ہے۔

إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ جب وہ کسی چیز کو پیدا  
کرنا چاہتا ہے تو بس ادھر اس سے کہا کہ ہو جاؤ اور ادھر وہ ہو گئی۔ اللہ کیا کسی سامان کا محتاج  
ہے۔ اس قسم کی آیتیں برابر ان فلسفیوں اور باطل مذہبوں کے رد میں ہیں۔ جو قدیم کو حادث  
قیاس کر کے قدیم کو بھی سلسلہ اسباب کا پابند سمجھے ہوئے ہیں۔

لہٰذا۔ ہندوستان کے ایک بے مغز غیر مسلم مذہبی لیڈر نے ایک سوال یہ اٹھایا تھا



کہ جب کوئی شے موجود ہی نہیں ہے تو یہ کہا کس سے جانا ہے؟ اس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ علم الہی میں تو موجود ہوتی ہی ہے۔ پس اسی کو حکم ملتا ہے کہ عالم غضریٰ میں بھی موجود ہو جائے اور قول لہ سے بھی مراد اس دو حرفی لفظ کا تلفظ نہیں اس لئے کہ یہ حروف تو خود ہی حادث ہیں۔ مراد اللہ تعالیٰ کا قول اس کیفیت کے ساتھ ہے جو اس کی شان کمال کے لائق ہے اور اور جس طرح اس کی دوسری تمام صفات کی تفصیلات ادراک بشری کی گرفت سے باہر ہیں۔ اس کے اس قول کی بھی کیفیت تفصیل کے ساتھ نہیں سمجھائی جاسکتی۔ مراد صرف یہ ہے کہ ارادہ الہی اور اس کی تعمیل کے درمیان کوئی بھی شے حائل یا حاجب نہیں بن سکتی۔

لبا چوڑا بملہ معترضہ ختم ہوا۔ اب پھر اصل موضوع پر آئیے اور وہ مولود جو جناب مریم کو عنایت ہوگا، وہ ہوگا کس صفت کا؟

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ (آیت)

اللہ اسے سکھادے گا کتاب اور حکمت اور تورات و انجیل۔

ان کلمات سے حضرت مسیح کے جس مقام غفلت کا اظہار مقصود ہے، وہ تو ظاہری ہے لیکن خود حضرت مریم کی بھی تشفی خاطر کا کتنا سامان ہوا جبار ہے! ارشاد گویا یہ ہوا جارہا ہے کہ تم غلین و پریشان نہ ہو بے شوہری اولاد کی بنا پر حلق تمہیں جتنا بھی مطعون و دروا کرے گی اس کی تلافی کے لئے اولاد بھی تمہیں کس پایہ کی عطا ہو رہی ہے؟

الکتاب، یہ طور اسم جنس تمام آسمانی کتابوں کے لئے آیا ہے اور الحکمة سے مراد تمام دینی علوم و معارف ہیں جو پیغمبر صاحب کتاب کو علاوہ اس کی مخصوص کتاب کے اس کی شرح و تفسیر کے طور پر عطا ہوتے ہیں۔ اور ابھی آگے سنئے:

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَآئِيلَ (آیت)

آپ کا بھیجنا اور آپ کی مرتبہ پیغمبر کا ہوگا کہ آپ نعوذ باللہ و شہد و باز ہوں گے۔ جیسا کہ یہود نے گڑھ لیا ہے۔ اور نہ خدا یا فرزند خدا جیسا کہ نصراہیوں نے فرض کر لیا اور



ہر پیر جس طرح اس وقت تک اپنی قوم کی جانب مبعوث ہوتا رہا تھا، آپ بھی اپنی قوم کی جانب مبعوث ہوں گے۔ اور آگے آپ کی زندگی کا مشن اور آپ کے فضائل و کمالات آپ ہی کی زبان سے بیان کرا دیے ہیں۔

اِنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ ۚ اِنِّیْ اَخْلَقْتُ لَکُمْ مِّنَ الطَّیْنِ کَهَشَّةٍ خَالِیَةً فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَبِکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَابْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتِی بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاتَّبِعُوْکُمْ بِمَا تَاْمُرُوْنَ وَمَا تَنْهَوْنَ فِیْ سُبُوْتِکُمْ ۚ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ (آیت)

اور وہ کہے گا کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں، تمہارے لئے مٹی سے پرند کی مانند صورت بنادیتا ہوں۔ تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے، میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کورھی کو اچھا کر دیتا ہوں۔ اور میں اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں اور تم جو کچھ کھاتے ہو اور جو کچھ گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو وہ تمہیں بتلا دیتا ہوں بے شک اس (سب) میں تمہارے لئے ایک نشانی ہے اگر تم ایمان والے ہو۔

لفظ آیۃ (نشانی) یہاں معجزہ مراد غوم میں ہے۔ معجزہ ہر اس واقعہ کا نام ہے جو عام اور متعارف سلسلہ اسباب سے الگ کسی پیر کی تائید یا شہادت میں واقع ہوتا ہے۔ فاعل اس کا تمام تر حق تعالیٰ ہی ہوتا ہے، جو ہر واقعہ موافق و معمول حسب سطور عام ہی کا ہوتا ہے۔

مِّنْ رَّبِّکُمْ (تمہارے پروردگار کی طرف سے) یہ اضافہ اس کی تاکید اور اس حقیقت پر زور دینے کے لئے ہے کہ معجزہ کا ظہور حق تعالیٰ ہی طرف سے ہوتا ہے۔



نہ کہ پیغمبر کے اختیار و قدرت سے۔ اَخْلَقُ کے ذیل میں یہ سمجھ لیجئے کہ فعل خلق کی نسبت جب انسان کی جانب ہوتی ہے، تو مراد کسی فعل کے اندازہ کرنے اور ایک خاص انداز سے اس کے درست رہنے کی ہوتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کی زندگی معجزات کے لئے مشہور ہے غوام بجائے دلائل و شواہد عقلی کے ہمیشہ معجزات و خوارق ہی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور یہودی تو اپنی انجو پسندی اور طلب خوارق میں کچھ اور بڑھے ہی ہوئے تھے۔

گھببۃ الطیر یعنی پرندوں کی شکل کے کھلونے مٹی سے بنا دیتا ہوں۔

فَانْفَحْ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَبِيْرًا۔ یعنی میرے نفخ دم سے ان میں جان پڑ جاتی ہے۔  
اس معجزہ کا ذکر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقوں کی چاروں مستند انجیلوں  
میں تو نہیں ہے البتہ قبطی کلیسا (Coptic Church) کی جو مستند انجیل ہے اس میں

یہ صاف مذکور ہے، جیسا کہ ڈاکٹر نیچ (Budge) نے اپنی کتاب (The Legends of our Lady Mary) کے مقدمہ ص ۲۹ پر نقل کیا ہے۔  
”دو پرندوں کی شکل کے جانور بتا دیتے تھے، جو اڑ سکتے تھے“

بِإِذْنِ اللَّهِ اور یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے میرے ارادہ و تصرف سے نہیں، بس  
اللہ کے حکم و اختیار سے ہوتا ہے۔

الْاَكْمَدَ، اندھوں کو بینا کر دینے کا ذکر انجیل میں متعدد مقامات پر ہے، مثلاً انجیل متی کے باب ۹ کے آیات ۲۷، ۳۰ میں ہے۔ اور انجیل مرقس کے باب ۸ آیات ۲۲ تا ۲۵ میں اور سب سے زیادہ تفصیل انجیل یوحنا کے باب ۹ کے آیات ۱ تا ۳۷ میں ہے۔ اور ان میں تصریح اندھے مادر زاد ہونے کی بھی ہے۔

الْأَبْرَحَ، کوڑھیوں کا بھی ذکر انجیل میں دو جگہ ہے۔ انجیل متی باب ۸ آیات ۱۴ تا ۲ میں ایک کوڑھی کی شفا یابی کا اور انجیل لوقا باب ۱۴ کی آیات ۱۱ تا ۱۴ تک میں دوسرے کوڑھیوں کے بالکل اچھے ہونے کا۔



اُحْيِ الْمَوْتٰی۔ اب رہا معجزہ احیاء اموات تو بزنا با میں تو اس کی تصریح ہی موجود ہے کہ ص ۲۳۴ و ص ۲۴۱ انگریزی ایڈیشن مطبوعہ آکسفورڈ۔ باقی دو انجیلیں جو رانہوں کو مسلم ہیں وہ بھی اس کے حوالوں سے خالی نہیں مثلاً انجیل لوقا باب ۷، آیات ۱۱ تا ۱۶ نیز آیت ۲۲۔ انجیل متی باب ۹، آیات ۱۸۔ ۲۵ اور انجیل یوحنا باب ۱۱۔ آیات ۱۔ ۴۴۔ تاکہ در تصریح کے لئے بِاِذْنِ اللّٰهِ مکرر آیا ہے کہ کہیں ان خوارق و تصرفات کو میری جانب نہ منسوب کر دینا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا، محض حق تعالیٰ کی قدرت و مشیت کا کرشمہ ہے۔ اور آخر میں جو ذکر آپ نے لوگوں کی ذخیرہ کی ہوئی چیزوں کی طلب دہی کا کیا ہے، وہ ایک مثال اور نمونہ ہے اس حقیقت کا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مخفی چیزوں پر مجھے بھی مطلع کر دیتا ہے آپ سے خوارق و عجائب کا صدور اس کثرت سے ہوا کہ انہیں کو دیکھ کر یہود نے آپ کو شعبہ باز کہنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ کا ذکر پہلی صدی عیسوی کے جوزیفس کی کتاب تاریخ آثار یہود (*History of Jewish Anti*) *quitis* میں اسی حیثیت سے آیا ہے۔ بلکہ اس وقت تک بھی جیوش انسائیکلو پیڈیا کی جلد ۷ کے ص ۱۶۷ پر یوں لکھا چلا آتا ہے۔

”یسوع نے بحیثیت معلم دین یا قانون ساز کے نہیں، بلکہ بحیثیت شعبہ باز

کے اپنی زندگی میں شہر و ناموری گلیل کے سادہ مزاج باشندوں کے حاصل کی۔“

نیابنی یا پیرانے نبی کی تردید و تخطیط کے لئے نہیں آتا بلکہ ہر جدید پیامبر پرانے پیامبر کی تجدید تکمیل و تصدیق ہی کے لئے ہوتا ہے اور ہر یہی بات آپ بھی فرما رہے ہیں کہ میں اپنی پیش رو کتاب توریت کی تصدیق کے لئے آیا ہوں۔“

قانونی جزئیات اور فقہی فروغ میں تسہیل و ترمیم، عمومی تصدیق و تائید کے ذرا بھی منافی نہیں حضرت مسیح کی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تمہارے جبر و دن اور رتیبوں نے اپنی طرف سے جو احکام توریت میں غلط لفظ کر دیے ہیں میں اس سارے بوجھ کو



تم سے دور کرنے آیا ہوں۔

یہ ساری پیش خیریاں مسیح کی زندگی میں پوری ہوتی چلی گئیں۔ ان آیتوں کے بعد مسیح کی زندگی کے اہل واقعات شروع ہوتے ہیں۔ جب مسیح کی زندگی میں حج تھوڑے سے حواریوں (ماہی گیروں) کے اور کوئی ان پر ایمان نہ لایا۔ بلکہ ان کی تکذیب و تحقیر ہی پر مشغول رہے تو اس وقت کا منظر:-

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ؟  
قَالَ الْحَوَّارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ.

جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے انکار دیکھا پایا، تو بولے میرا کون مددگار ہوگا  
اشہد کے لئے تو حواری بولے کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔

یعنی جب مسیح اپنی ہماری مسیحی تبلیغ کے باوجود یہود کے عمومی رویہ سے سخت دکھ  
اٹھاتے رہے اور ان کی طرف سے انکار ہی تفرود و طغیان کے ساتھ پاتے چلے گئے، تو قوم  
کو نصرت دین کے لئے آواز دی۔ اس پر حواری بولے کہ ہم حاضر ہیں۔  
لفظ حواری پہلی دفعہ آیا ہے، تو اس کا مفہوم بھی سمجھنے چاہئے۔

لفظی معنی کپڑے کو دھونے اور اسے اُجھلا اور صاف کر دینے والے کے ہیں۔ اور حضرت  
کے ابتدائی ماستے والے سمندر کے کنارے کام کرنے والے ماہی گیر ہی تھے۔ اس لئے اس کے  
بعد آپ کے رفیقوں اور صحابیوں کا لقب ہی حواری پڑ گیا۔ اور مجازی معنی مخلص و مطہر کے  
بھی قرار پائے۔

چنانچہ حدیث میں حضرت زبیر صحابی کے لئے حواری رسول کا لقب آیا ہے۔  
اَمَّا يَا لَهِ ۚ وَاشْهَدُ يَا نَا مُسْلِمُونَ ۝ (آیت ۵۲)

ہم ایمان لے آئے اللہ پر اور آپ کو ادا رہے گا کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

رَبَّنَا اٰمَنَّا بِمَا اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا



مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝ (آیت ۵۳)

اسے بتا رہے ہیں کہ وہ گواہ ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اس پر جو کچھ آپ نے اُتارا ہے اور ہم نے بیرونی اختیارات کی ان رسول کی سوہم کو ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے جو تصدیق کرتے ہیں۔

یہ اہل کتاب ہر دور کے سچے مسلمانوں کی طرح توحید کے پورے طور پر قائل تھے اور ابن اللہ اور "اقنوم" وغیرہ کے تخیل سے بھی نا آشنا۔ مسیح کے یہ صحابی مسیح کے گفتگو کرتے کرتے غلط توحید سے براہ راست اللہ سے مناجات کرنے لگے ہیں۔ قرآن مجید نے ایسے موقعوں پر بار بار یہ کیا ہے کہ بندوں کی گفتگو کا رخ دفعۃً اللہ سے مناجات کی طرف پھیر دیا ہے۔ کیا ٹھکانا ہے اس اہتمام توحید کا۔ اس مکالمہ کے بعد جو کچھ گزری اسے بجائے تفصیل کے قرآن مجید نے اس موقع پر کمالیہ بجا رہے دو ہی لفظوں میں ادا کر دیا ہے۔

وَمَكْرُؤًا وَّمَكْرًا لِلَّهِ ۝ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۝ (آیت ۵)

اور ان لوگوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ بہترین خفیہ تدبیر کرنے والا ہے۔

لفظ "مکر" اللہ کی جانب منسوب کرنے سے آپ وحشت نہ کریں۔ یہ اُردو کا مکر نہیں۔ جو ہمیشہ برائی ہی کے موقع پر آتا ہے اور جس کام ادنیٰ فریب اور دھوکا ہے۔ یہ عربی کا مکر ہے جس کے معنی صرف خفیہ تدبیر کے ہیں۔ یہ بُرے اور اچھے ہر موقع کے لئے عام ہے حضرت مسیح پر مقدمہ چلنے اور پھر عدالت سے حکم سزا پانے کے بعد آپ جس طرح نفاذ سزا سے محفوظ رہے یہ ساری داستان ایک دوسری صحبت میں تفصیل سے سنئے گا

— (۳۳) —

اسی سلسلہ میں چند آیتوں کے بعد ذکر حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا آتا ہے۔ اب



وہ ملاحظہ ہو :

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خُلِقَ مِنْ

تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ (آیت ۵۹)

بے شک حضرت عیسیٰ کا حال اللہ کے نزدیک آدم کے حال کی طرح ہے، اللہ نے

ان کو مٹی سے بنایا۔ پھر کہا جاوے اور ہو، چنانچہ وہ وجود میں آگئے۔

یہ شکیست عیسیٰ و آدم کے درمیان کس حیثیت سے، جواب ہے کہ بشر محض اور حادث

مخلوق ہونے کا اشارہ عیسائیوں کے عقیدہ ابن التائیت کی جانب سے۔ سوال انھیں سے

ہو رہا ہے کہ تم عیسیٰ کو فوق البشر کیسے مان رہے ہو؟ اگر یہ کہو کہ وہ بغیر باپ کے توسط کے

پیدا ہوئے، اس لئے فوق البشر ٹھہرے، تو پھر آدم کو بھی فوق البشر کیوں نہیں مانتے وہ تو

عیسیٰ سے بھی عجیب تر صورت سے پیدا ہوئے یعنی ماں اور باپ دونوں کے توسط کے بغیر۔

اللہ کسی بشر کے پیدا کرنے پر کسی مخصوص طریقہ وجود و ظہور پر مجبور نہیں مطلق شکیست

اس کے لئے کافی ہے۔ اور یہی تو آفرینش عیسیٰ میں پوری طرح مؤثر تھی

حضرت عیسیٰ کے بے باپ کے پیدا ہونے پر کوئی تصریح انفس قرآن مجید میں نہیں

لیکن اتنے کھلے اشارے اور قرینے موجود ہیں جو اس عقیدے کو قریب بہ صراحت بنادیتے

کے لئے کافی ہیں۔

خود سچوں میں ایک قدیم فرقہ (Arians) کا ہوا ہے۔ اس کا بانی Arius

چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں اسکندریہ کالات پادری تھا۔ انسا ایکلو پڈیا برطانیکا

طبع چہار دہم کی جلد اول ص ۵۰۴ پر اس کی تعلیم بھی درج ہے کہ مسیح قدیم و غیر مخلوق نہیں مخلوق

و حادث ہیں۔ اور ان سے بھی قبل تیسری صدی عیسوی میں انطیوخ (انطاکیہ) کے بطریق پالی

کی تلقین کبھی یہی تھی کہ عیسیٰ مسیح کی پیدائش ایک دوشیزہ کے بطن سے ہوئی تھی۔ یہ دوسرے

روح القدس اس لئے تھے وہ بشر محض، ہاں روح القدس کے توسط نے انھیں مقدس



بھی بنادیا تھا۔ اس لئے وہ مسیح بھی تھے۔ لیکن شراب الوہیت بہر حال نہ تھے۔ اس عقیدہ کے لئے ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا آف ریسیچس اینڈ ایسیٹکس جلد ۱۱ ص ۱۷۱ مسیحیوں کے صاحبِ قسم طبقہ میں اصلاحی تحریکیں صحیح عقیدہ کی برابر اٹھتی رہی ہیں۔ لیکن کلیسا کے عام جمود و تعصب نے کبھی ان اصلاحیوں کو آگے بڑھنے اور سرسبز نہ ہونے دیا۔ خود آج بھی مسیحیوں میں ایک فرقہ وارانہ (Unitarians) کے نام سے موجود ہے جس میں بڑے بڑے مشہور قابلِ فاضل ہوئے ہیں۔ مثلاً آنجنہانی ال پی جیکس (L.P. JACKS) ایڈیٹر۔ ہمبرٹ جرنل (HIBBERT JOURNAL) اس کی تعلیم بھی اسے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ یہ فرقہ تثلیث کا بالکل منکر و مخالف ہے اور حضرت مسیح کو افضل البشر اور برترین انسان ماننا ہے۔ لیکن ان کی الوہیت کا قائل کسی درجہ میں بھی نہیں

### — پیج (۳۲) پیچہ: —

اور اسی مکالمہ مسیح و مسیحیت کے تہمت کے طور پر وہ آیت بھی ملاحظہ ہو جائے جس کا تعلق سیرت نبوی کے ایک اہم واقعہ سے ہے۔ مدینہ منورہ میں آپ کے قیام کو نو سال ہو چکے تھے اور حجاز پر پورا تسلط مسلمانوں کا قائم ہو چکا تھا کہ ۹ھ میں بخران (NAGRAN) کے مسیحیوں کا ایک وفد چودہ ارکان پر شامل خدمت میں حاضر ہوا، گفتگو الوہیت مسیح پر رہی۔ اسلامی عقیدہ یعنی بشریت مسیح کی معقولیت بالکل واضح و ظاہر تھی۔ لیکن وفد اپنی بات پر اڑا رہا۔ ادھر آپ کو دھن لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح یہ لوگ بھی دین حق قبول کر کے جنت کے وارث و حقدار بن جائیں۔ آخر میں آپ نے وہی کیا جو شاید ہر سچا اور مخلص داعی حق ایسے موقع پر کرتا۔ آپ نے فرمانِ خداوندی کے تحت عیسائیوں کو مباہلہ کی دعوت دے دی کہ زبانی گفتگو تو بہت کچھ ہو چکی، اب آؤ ہم تم اپنے خاص عزیزوں کو اپنے ہمراہ لے کر اپنے پروردگار ہی سے بتصریح و احتجاج



عرض کریں کہ جو فریق ناحق پر ہوا اس پر اللہ کی لعنت نازل ہو، آپ نے یہ فرمایا اور اپنی اولاد حقیقی و حکمی یعنی سیدہ فاطمہؓ و سیدنا علیؓ، سیدنا حسنؓ، سیدنا حسینؓ کو ہمراہ لے کر شریف لے آئے، لیکن تاریخ کے راوی کا بیان ہے کہ عیسائیوں کی ہمت عین وقت پر جواب دے گئی اور عافیت اسی میں نظر آئی کہ بجائے اس آزمائش میں پڑنے کے، جزیہ دے کر اور ذمی رعایا بن کر اسلامی حکومت کے ماتحت رہنا گوارا کر لیا۔

اب قرآن کا بیان سنئے

ذَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ  
وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ  
عَلَى الْكَافِرِينَ ۝ (آیت ۶۱)

تو آپ (ان مسیحیوں سے) کہہ دیجئے کہ اچھا آؤ ہم بلا لائیں اپنے بیٹوں کو  
بھی اور اپنی خورتوں کو بھی اور تمہارے بیٹوں کو اور تمہاری خورتوں کو بھی اور اپنے کو بھی اور  
تمہارے تئیں بھی، پھر ہم خشوع سے دعا کریں اور جھجھوٹوں پر لعنت بھیجیں۔

سر ولیم میور کی سیرت محمدی (Life of Mohammed)  
انیسویں صدی میں اپنے موضوع پر مشہور ترین کتاب تھی اور سر ولیم میور کوئی مسلمان  
نہیں، مسیحی تھے، اور محض مسیحی ہی نہیں، مشنری یا مبلغ مسیحیت بھی۔ اپنی اسی کتاب میں  
صفحہ ۳۶۰ پر واقعہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں :

”واقعہ میں محمدؐ کے ایمان کی پہلی بالکل نمایاں ہے، نیز ان کے اس عقیدہ کی  
شہادت کہ ان کا تعلق عالم غیب سے جڑا ہوا ہے اور اس لئے کہ حق تبارک و تعالیٰ انھیں کے  
ساتھ ہے۔ اور یہ کہ ان کے خیال کے مطابق مسیحیوں کے پاس بجز ظن و تخمین کے  
کچھ نہ تھا۔“



## ﴿ ۳۵ ﴾

توحید پر زور تو قرآن مجید میں بے شمار بار آیا ہے۔ یہاں بھی دو آیتوں کے بعد اہل کتاب نصرائیوں سے خطاب اس موضوع پر زور دار انداز سے ہے:-

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنِنَا  
وَبَيْنَكُمْ إِلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا  
وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا  
فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝ (آیت ۴۵)

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب آجاؤ ایسے معمول کی طرف جو ہم میں تم میں  
مشترک ہے کہ تم بجز اللہ کے کسی کی پرستش نہ کریں، اور نہ کسی کو اس کا شریک  
ٹھہرائیں اور نہ ہم کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائیں، پھر اگر وہ شبہ کریں  
تو تم کہہ دو (اے مسلمانو) کہ تم گواہ رہنا ہم تو بہر حال فرمانبردار تھے۔

سَوَاءٍ بَيْنِنَا وَبَيْنَكُمْ یعنی وہ بنیادی عقیدہ جو ہم مسلمانوں اور تم نصرائیوں  
دونوں کو مسلم ہے اور وہ دونوں میں مشترک ہے جس کی قدر و قیمت اور افادیت پر  
سب کو اتفاق ہے اور جس کی تعلیم تمہارے ہاں کے پیران برحق ہمیشہ دیتے آئے  
ہیں، اور یہودیت و نصرائیت دونوں دیوؤں کی بنیاد ہی اسی پر ہے  
تو یہ تو خیر تاکید توحید اور رد شرک کے لبریز ہی ہے، انجیل میں بھی تعلیم یہی موجود  
ہے۔ مئی باب کی آیت ۱۰ میں ہے:-

”تو خداوند خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر“

اور یہ تو ساری انجیلوں میں کہیں بھی نہیں ملتا ہے، نہ صراحت نہ دلالت نہ اشارہ کہ  
کچھ پرستش تو صرف خدا کی کرو اور بعض پرستشوں میں ابن اللہ اور روح القدس کو بھی



شریک کر لیا کرو۔

اَدْبَابًا یَنْ دُونِ اللّٰهِ، مخلوق پرستی اور مخلوق کی شرکت الوہیت کی تردید تو آپس میں ہی چسکے۔ اب تردید مخلوق کی ربوبیت کی ہو رہی ہے۔ غیر اللہ جس طرح معبود اگر نہیں، اسی طرح رب و مطاع مطلق بھی نہیں۔ نصرانیوں نے طرح طرح کے شرک نکال لئے تھے، اسی طرح عجمتیں بھی طرح طرح کی گڑھ رکھی تھیں۔ پاپائے روم کی معصومیت، کیتھولک دنیا، اور کلیسا یعنی پادریوں کے اجماع کی معصومیت کل مسیحی دنیا کا متفقہ عقیدہ ہے۔ ان سائیکلو پیڈیا برٹانیکا، طبع چہار دہم، جلد ۱۶ ص ۶۳ پر یہ عقیدہ یوں درج ہے:

”ایک مخصوص کلیسا کے بغیر نجات ممکن نہیں۔ اس پر ہمیشہ روح القدس کا سایہ رہتا ہے۔ اس لئے مسائل میں کلیسا سے امکان خطا ہی نہیں۔“

قرآن مجید نے انسان کی ان ساری خود ساختہ عجمتوں پر ضرب لگا دی اور کسی کو رب ٹھہرانے کے لئے یہ لازمی نہیں کہ لفظاً و قولاً سے رب ہی کہا جائے۔ کسی فقیہ کو امر شد کو، امام کو اگر معصوم مان لیا اور اس کے قول کو دلیل سے بے نیاز قرار دے لیا تو یہ اسے رب ہی مان لینا ہوا۔

بَعْضُنَا بَعْضًا سے مفسر ابن حبان غرناطی نے یہ نکتہ خوب نکالا ہے کہ الوہیت ربوبیت دونوں کی تردید تو اسی ایک فقرے سے ہو گئی۔ جب ایک دوسرے میں ثلثیت اور رشتہ ہم نسب کا قائم ہو گیا تو سب بندے ہونے کی حیثیت سے برابر ہو گئے۔ اور الوہیت و ربوبیت اب باقی ہی کہاں رہ گئی۔

فَقُولُوا الشَّهَادَاتُ بِآثَانِ الْمُسْلِمُونَ، قرآن کے انجازی انداز بیان کا ایک اور نمونہ۔ اہل کتاب نصرانی یا یہودی تو آج بھی اسلام کی توحید خالص کی گواہی دے رہے ہیں۔ اور وہ اپنی کتابوں میں لکھتے چلے آ رہے کہ مسلم قوم توحید خالص کی حامل ہے۔



—: (جاسم) :—

یہ بنیادی حقیقت کہ دین مقبولِ اشر کے ہاں صرف اسلام ہی ہے نہ کہ ہر وہ چیز جسے دین کے نام سے پکارا جاتا ہے، پہلے بھی بیان ہو چکی تھی اور اس سس سورہ آل عمران میں

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ -

دین تو اشر کے نزدیک بس اسلام ہی ہے۔

یعنی اسلام اپنے اصطلاحی معنی میں، اور لفظی معنی میں تو ہر بھگت جانے کو اسلام ہی کہتے ہیں۔

اب یہاں اس سے بڑھ کر قطعی صورت میں اعلان ہوتا ہے۔

وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ  
وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ (آیت ۸۵)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دین (اپنے لئے) تلاش کرے گا وہ اسے

ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا۔ اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں ہوگا۔

تا کہ درماتیکہ دیکھیے، اثباتاً و نفیاً دونوں طریقوں سے بیان کا ماحصل یہی ہے

کہ دین نجات دلانے والا، آخرت میں کام آنے والا دین تو بس یہی اسلام ہی ہے۔

جس کی کتاب قرآن ہے، اور جس کے لانے والے محمد رسول اللہ ہیں۔ اس ایک دین

کے سوا اور جتنے بھی دین اپنی موجودہ صورت میں موجود ہیں، ان کی مثال فرسودہ اور

ہلکالی باہر سلکوں کی ہے کہ کہنے کو سیکے تو وہ بھی ہیں۔ لیکن وہ سکے جب بازار میں چلنے

سکیں تو ان کا سکہ ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ دوسرے دین و مذہب عملاً کیسے ہی رہے

ہوں ان کی موجودہ صورت میں انھیں دین حق کی طرح سچا سمجھنا، ہر دین و مذہب کے



نجات کے لئے کافی سمجھنا، یا سب مذہبوں کو بلا جلا کر ان کا ایک مغویہ تیار کرنا نام نہاد کناک ویر و حرم، کعبہ و کلیسا، شیخ و برہمن، مسجد و بت کدہ، سب یکساں ہیں اور ایک حکم میں داخل۔ یہ سب ضلالت و بے دینی ہی کی شکلیں ہیں، اکبر و فیضی، ابوالفضل، داراشکوہ وغیرہ ان ناکام کوششوں کے لئے بجا طور پر بدنام ہو چکے ہیں اور وحدت ادیان کے نام سے آج بھی بعض اہل قلم اسی نامراد مرض میں مبتلا، اپنی روشن خیالی اور رواداری کے پردے میں اعلان اسی بد دینی کا کر رہے ہیں۔

### ————— (۳۷) بیچ: —————

خانہ کعبہ کی قدامت بھی اہل کتاب کے لئے ایک مختلف فیہ مسئلہ رہی ہے۔ قرآن مجید نے اس کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے، پہلے ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صحیح مقتدرانی اور پیشوائی کا ہے۔

قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَ  
مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ آیت ۹۵

آپ کہہ دیجئے (اے رسول) کہ اللہ نے سچی بات فرمادی تو تم پیروی کر دیجیے  
راہ پر چلنے والے ابراہیم کے دین کی اور وہ تو مشرکین میں سے نہ تھے۔

یعنی قرآن نے امر حق واضح کر دیا اور تم نے جو جھوٹ اپنے ہی اکابر اور اپنے ہی  
مقدس نوشتوں پر باندھے تھے، ان سب کی قلعی کھول دی۔ تو تم سب، کیا اہل کتاب اور  
کیا مشرک، ابراہیم ہی کی پیروی کرو۔ اور خود بھی سچے اور ان کا لایا ہوا دین بھی سچا۔ اور جنہیں  
تم بھی اپنا پیشوا مانتے ہو۔ ان میں تو بہر حال کہیں سے بھی شاہد شرک نہ تھا۔

اور اس کے معاً بعد ذکر ان کے شہر مکہ اور ان کی تعمیر کعبہ کا ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ  
مَبْرُكًا ۚ وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ۝ آیت ۹۶



بے شک سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے (سب کے لئے) برکت والا اور سارے جہاں والوں کے لئے رہنما۔

دنیا میں پہلا مکان بہ طور عبادت گاہ کے، یعنی خانہ کعبہ، جس کی روایات حدیث کے مطابق ابتدائی تعمیر حضرت آدمؑ نے کی تھی اور منہدم ہونے کے بعد پھر اس کی از سر نو تعمیر حضرت خلیلؑ اور حضرت اسمعیلؑ کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

قرآن کریم دعویٰ سے کہتا ہے کہ قدیم ترین عبادت گاہ اس سرزمین پر ہے اور دیکھیے کہ ہسٹوریس ہسٹری آف دی ورلڈ (HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD) والے کیا کہتے ہیں۔

”یہ پتھر کی مریخ عبادت گاہ جس کی عمر نامعلوم قدامت کی ہے، مکہ کے حاد کے اندر تھی“ (جلد ۸ ص ۱۰۵)

اور پھر کہتے ہیں:-

”نسلہ نسل سے یہ مقدس ترین عظمت کی حامل رہی ہے۔ اور اس کی

بابت عقیدہ یہی رہا ہے کہ خود یہوداہ (خدا) نے اسے عرب قوم کو بہ طور تحفہ دے دیا تاکہ وہ دوسری قوموں پر اس قوم کے تفوق کی گواہ رہے۔

یہ ابراہیم اور ان کے فرزند اسمعیل کا عبادت خانہ بیت اشرا رہا ہے“ (جلد ۸ ص ۱۹۸)

گویا اس کی قدامت کی تاریخ، تاریخ کے حافظہ میں بھی نہیں۔ اتنی غیر معمولی قدامت فرنگی فاضلوں کو بھی تسلیم ہے اور اس کا شروع ہی سے عبادت خانہ ہونا مسلم ہے۔ کعبہ کو قدیم ترین عبادت گاہ کہہ کر یہود کو بتا دیا گیا کہ یہ بیت المقدس سے بھی قدیم تر ہے۔

اور سنئے عہد نامہ عتیق میں اتنی تحریف و تصرف کے باوجود بھی ایک جگہ ذکر کیا گیا

باقی رہ گیا ہے۔ چنانچہ زبور داؤد کی مناجات ۸۴ کی آیت ۶ میں ہے۔

”وہ بکر کی وادی میں گزر کرتے ہوئے اسے ایک کنواں بتاتے“



اور بائبل کے قدیم مترجموں نے ترجمہ میں اپنی بے احتیاطی کی عام عادت کے مطابق اسے بجائے علم اور اسم مکان قرار دینے کے اسم نکرہ قرار دے دیا ہے۔ اور اس کا ترجمہ ”رونے کی وادی“ کر دالا۔ صدیوں کے بعد اب غلطی کا احساس ہوا، اور اب جیوش انسائیکلو پیڈیا میں اقرار ہے کہ یہ ایک مخصوص بے آب وادی کا نام ہے (جلد ۲ ص ۱۱۵) اور اب جتنا قریب آگے ہیں تو انشرا نہیں یہ لکھنے کی توفیق اور دے کہ یہی وادی بے آب کہ معظمہ ہے۔

بیکہ۔ کہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ عربی علم الصرف کے ایک قاعدہ کے مطابق یم اور ب کے درمیان تبادلہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ لازم اور لازم اور راتم و راتب کی مثالیں ہیں۔

اسی قاعدہ کے ماتحت کہ بکہ کا مراد د فبادل ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ کہ نام ہے کل شہر کا۔ اور بکہ کا اطلاق ہوتا ہے مسجد حرام اور مطاف پر۔ ان مختصر لفظوں میں اس کی دو صفات بیان کر دی گئی ہیں۔ ایک مَبَادِکَایہ وہ مقام ہے جہاں مادّی اور روحانی، دنیوی و دنیوی برکتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ دوسرے هُدًی لِلْعَالَمِیْنَ سارے جہاں کے لئے مرکز ہدایت ہے۔ بہ طور قسبہ کے

اور مؤرخ مسعودی نے اہل جاہلیت کا یہ عقیدہ نقل کیا ہے کہ بیت الحرام ستارہ زحل کا ہیکل (مندر) ہے اور زحل اس کا مرتب ہے۔ اور چونکہ زحل کی بقاء کا مقام ہے۔ اس لئے جو چیز بھی اس کی جانب منسوب ہوگی اسے بھی زوالی نہ ہوگا۔ اور اس کی عظمت و تکریم سدا باقی رہے گی۔ عقیدہ جاہلیت کا سہی تاہم اس سے شہادت نہ کُفّہ کی قدمت کی بل ہی جاتی ہے۔



—: (۳۸) :—

قرآن مجید کی چوتھی سورت کا نام سورہ النساء ہے۔ اور نساء کہتے ہیں عورتوں کو۔ اس لمبی سورہ میں بیشتر بیان عورتوں کے مسائل اور ان کے احکام اور عورتوں کے حقوق و فرائض کا ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ اسلام کے نظام معیشت میں کتنا بڑا ذیل اور کمزوری است عورت کو حاصل ہے۔ علاوہ بیسیوں تفریق عزائمات کے ایک مستقل سورہ ہی اس موضوع پر ہے۔ پہلی ہی آیت کتنے مختلف پہلوؤں پر شامل اور کیسی کیسی حکمتوں کی جامع ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ  
نَفْسٍ وَاحِدَةٍ

اے لوگو! تقوئے اختیار کرو اپنے پروردگار کا جس نے تم (سب) کو  
ایک جان سے پیدا کیا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ خطاب قریش، بلکہ محض اہل عرب سے بھی نہیں، بلکہ سارے  
ہی انسانوں، نوح بشر سے ہے۔

یہ عنوان خطاب بجائے خود پیام اسلام کی عالمگیری کا اعلان کر رہا ہے۔ انسان  
کسی نسل، کسی رنگ کا ہو، ہر حال ایمان کا بلکہ کسی مذہب تقوئے کا مکلف ہے۔ الناس  
یوں سارے نوح بشر کے لئے ہے۔ اور پھر جب سورت کی ہے بھی نہیں۔ بالاتفاق  
مدنی ہے۔

اتَّقُوا رَبَّكُمُ اللہ سے ڈرنا دراصل اس کے احکام کی مخالفت سے ڈرنا ہے  
ورنہ اللہ تعالیٰ کی ذات بجائے خود کوئی خوف کھانے والی چیز نہیں۔ بلکہ سزا و سزا  
عظمت ہی کے قابل ہستی ہے اور لفظ رَبَّكُمُ لاکر اشارہ کر رہا ہے کہ جن احکام کی



مخالفت سے ڈرایا اور رد کا جارہا ہے۔ ان سے مقصود تھا متر بند سے ہی کی دہر بیت اور پرورش ہے۔

خَلَقَكُمْ <sup>مسئلہ</sup> ارتقاء جس حد تک اور جس معنی میں بھی صحیح ہو، قرآن مجید کو اس کوئی بحث نہیں۔ وہ زور صرف اس پر دیتا ہے کہ انسان چاہے بتدریج ہی وجود میں آیا ہو، بہر حال اللہ کا خلق کیا ہوا نیست سے ہست میں اللہ ہی کا لایا ہوا ہے۔ وہ ضرب انسان کی خود وجودی پر لگاتا اور اثبات اس کی مخلوقیت کا کر رہا ہے۔

مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ، یعنی ابو البشر آدم علیہ السلام ہے۔ وحدتِ نسل انسانی کا سبق اپنے علی اور دور رس نتائج کے لحاظ سے بڑا ہی اہم ہے۔ آخری مورث اعلیٰ ہر فرد بشر کے، ہر کالے اور ہر گورے کے، ہر برہمن اور ہر شہودر کے، ہر ہندی اور ہر چینی کے، ہر حبشی اور ہر فرنگی کے، ابو البشر حضرت آدم ہیں۔ یہ نہیں کہ فلاں نسل کے مورث اعلیٰ کوئی ہوں، اور فلاں نسل کے کوئی اور۔ اور نہ یہ کہ برہمن نسل کے لوگ برہما جی کے سے پیدا ہوئے اور پھتری نسل والے برہما جی کے سینے سے اور ویش ان کی ٹانگوں سے۔۔۔ اصلاً سب انسان انسان ایک ہی ہیں۔ آج کا انسان اگر اسی ایک سبق کو یاد رکھ لے تو جنگیں اور خون ریزیاں کتنی کم ہو جائیں اور معا بعد یہ ارشاد ہوتا ہے: وَخَلَقَ مِنْهَا ذَوْجَهَا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا، یعنی حوا زوجہ آدم علیہ السلام کو۔ یہ تخلیق کس طرح سے ہوئی ہے اس کے ذکر سے قرآن مجید بالکل خاموش ہے اور حدیث بھی تقریباً۔۔۔ جس سے معلوم اور معروض روایت کا حوالہ دیا جاتا ہے، اس میں ذکر نہ آدم کا نہ حوا کا۔ اس میں بیان محض عورت کی کچھ سرشتی کا ہے۔ مِنْهَا میں هَآ کی ضمیر عموماً نفس کی طرف راجع سمجھی گئی ہے لیکن ایک دوسرا قول بھی تفسیروں میں نقل ہوا ہے کہ مِنْهَا یہاں جِنْسِهَا کے معنی میں ہے۔ کبیر میں ابو سلمہ اور بکر المحیط میں ابن حجر کے حوالہ سے اور جنس عورت کے معنی لیکر۔



تو حضرت حوا کی ذات کا کوئی سوال ہی نہیں رہ جاتا۔

یہ روایت تو صرف تو ریت مردہ کی ہے کہ خدا نے آدم کی ایک پسلی ان کے سونے کی حالت میں نکالی اور نکالی ہوئی پسلی سے ایک عورت پیدا کر کے آدم کے پاس بھیج دی۔ اور یہ روایت صحیفہ پیدائش باب دوم کی آیت ۲۲-۲۳ میں ہے۔

یہی حدیث نبویؐ تو جس حدیث کا حوالہ بار بار دیا جاتا ہے تو وہاں ذکر نہ حضرت آدم کا ہے نہ حضرت حوا کا بلکہ محض عورت کی جنس کی پیدائش اور اس کی کچھ شرعی کا ہے۔ پھر یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ حدیث میں حضرت حوا کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے بطور استعارہ ارشاد کر دی گئی ہو جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ انسان کی پیدائش جلد بازی یا غلبت پسندی سے ہوئی ہے۔ اور تفسیر بحر المحیط میں اسی پہلو کو پیش کیا گیا ہے، اور اس معنی کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ حدیث میں یہ نہیں ہے کہ حوا کو اس طرح پیدا کیا گیا، بلکہ جنس عورت کا ذکر ہے اور یہ بہ آسانی مجاز و استعارہ پر محمول ہو سکتا ہے۔ چنانچہ لغت حدیث مجمع البحار میں یہ قول کرمانی کے حوالہ سے نقل ہوا ہے اور ایک حاشیہ تفسیر ابن کثیر میں بھی ایسا ہی نقل ہوا ہے۔

اور خود ایک حدیث نبویؐ صحیح بخاری کی کتاب النکاح میں اور صحیح مسلم کی کتاب الرضاع میں اس مضمون کی نقل ہوئی ہے کہ عورت مثل پسلی کے ہے اور لغت میں خود ضلع کا مفہوم تو ثنائی ہی ہے۔ ورنہ اصل معنی تو کبھی یا میل یا انحراف ہی کے ہیں۔ زمخشری کی مشہور لغت حدیث کتاب الفائق میں ہے الضلع اللیل یعنی ضلع مجھ کا ذکر کرتے ہیں اور اسی سے ملتی ہوئی عبارت ابن اثیر کی لغت حدیث نہایت ہی ہے۔ آگے ارشاد ہوتا ہے :-

وَبَثَّ مِنْهُمَا رَجُلًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ

اور پھیلا دیے ہم نے ان دونوں سے مرد اور عورت کثرت سے



دنیا کی انسانی آبادی اب تک جتنی ہو گئی اور جتنی قیامت تک ہوگی سب اسے  
 ہوگی۔ لفظ کثیر کا اطلاق اگر اس آن گنت آبادی پر بھی نہ ہوگا تو اور کس پر ہوگا؟  
 خیالی اس سلسلہ میں صرف یہ ہے کہ یہ نسل غیر محدود و غیر محدود حضرت آدم  
 ہی کی نہیں بلکہ آدم و نوح و دودوں کی ہے

وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ

اس اللہ سے تقوٰی اختیار کرو جس کے واسطے سے ایک دوسرے سے مانگتے

ہو اور قرابتوں کے باب میں بھلی۔

تقوٰی انہی یا ادائے حقوق اللہ کا حکم ابھی مل چکا ہے، اور ایک ہی آیت کے  
 اندر دوبارہ پھر مل گیا۔ جتنی تاکید اس سے مقصود ہے ظاہر ہی ہے، لیکن اب کی جو حکم تقوٰی  
 ملا وہ ارحام یعنی عزیزوں یا قرابت داروں کے باب میں ہے، اور الارحام کا عطف  
 اللہ پر ہے، اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ جس طرح محتاط حقوق اللہ کے باب میں  
 رہتے ہو۔ اسی طرح قرابتوں کے معاملہ میں بھی رہو۔ یہ ہے قرابت یا رشتہ داری کی  
 اہمیت اسلام میں!

درحقیقت امت کے نظام اجتماعی کا سنگ بنیاد ہی شریعت نے خاندان کو قرار دیا  
 ہے، عزیزوں، قریبوں، خاندان اور برادری والوں کے ساتھ حسن سلوک اسلام میں کوئی  
 دوسرے درجہ کی نہیں۔ اولیٰ درجہ کی اہمیت رکھنے والی چیز ہے۔ اور اس معنی میں ایک  
 حدیث نبوی بھی ہے کہ رحم یعنی رشتہ قرابت اللہ سے دعا کرتا رہتا ہے کہ جو مجھے جوڑے  
 رکھتا ہے اللہ اسے جوڑے رہے۔ اور جو مجھے قطع کرتا ہے اللہ اسے قطع کرے اور  
 آیت کا خاتمہ اس ٹکڑے پر ہوتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝ (آیت ۱)

بے شک اللہ تمہارے اوپر نگراں ہے۔



یعنی اس حکم کو ہلکا اور سرسری نہ سمجھو، وہ عالم الغیب جس طرح تمہاری عبادتی زندگی کانگراں ہے اسی طرح وہ تمہارے خانگی، اجتماعی سارے ہی معاملات کانگراں ہے!۔ آج اس حکم کا استحضار اگر دلوں میں رہے تو اُمت کے اندر اس قدر تلخیوں، رنجشوں، خانہ جنگیوں کا وجود کہیں باقی نہ رہ جائے؟ لیکن ہر صورت جہاں تک کتابی تعلیم کا تعلق ہے، اسلام خانگی حقوق اور ذمہ داریوں کی تاکید کے لحاظ سے بس آپ ہی اپنی مثال ہے۔

### ————— ﴿۳۹﴾ —————

مذہب کے دائرے میں ایک اہم مسئلہ توبہ اور قبول توبہ کا آگاہ نام ہے، گناہ نام ہے کسی حکم الہی کی دانستہ خلاف ورزی کا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بشری فطرت کی کمزوری کے لحاظ سے گناہوں کا معذور و توناگزیر کیا ہے، تو اب گرفت اور عذاب الہی سے بچنے کی کوئی راہ بھی ہے! بعض مذہبوں نے کرم یا مکافات عمل کے قانون کے نام سے اس باب کو سرے سے بند ہی کر دیا ہے، یہ کہہ کر کہ ہر شخص کو اپنے ہر عمل کا نتیجہ ہر حال میں بھگتنا ہی پڑے گا، اور بعض مذہبوں نے اس کے برعکس معافی کا دروازہ شفاعت کے تحت میں لا کر اتنا وسیع کر دیا ہے کہ کوئی گناہ گناہ ہی نہیں رہ جاتا جب ایک مستقل اور مطلق شافع موجود ہے، تو پھر وہ ہر مجرم کو چھڑا ہی لے گا اور جزا کا قانون سرے سے معطل و مہل ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن نے حکیمانہ راستہ توسط و اعتدال کا اختیار کیا ہے، اس نے ہر اختیار پر جرم کے لئے ندامت، پچھتاوے کی راہ کھلی رکھی ہے، جب بھی مجرم کو اپنی غلطی، غلط کاری کا احساس ہو جائے، اس کا عملی مدارک تلافی اور کفارت سے کر دے اور اگر اس کی گنجائش ہی نہ باقی ہو تو حاکم مطلق کی بارگاہ میں معافی پیش کرے پچھتاوے، اگر گڑا ہے، روٹے دھوٹے، وہ غصہ و زحیم توبہ قبول کرے گا، اور اسے معافی کا پروانہ عطا مستعد کر دے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:



إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ  
بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ  
يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (آیت)  
توبہ جس کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے، وہ تو بس انہیں لوگوں کی ہے  
جو بڑی حرکت نادانی سے کر گزرتے ہیں، اور پھر قریبی وقت میں توبہ  
کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے، اور اللہ بڑا علم والا  
بڑا حکمت والا ہے۔

يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ - سُوء کا لفظ عام ہے، چھوٹی بڑی ہر  
ہر معصیت کے لئے۔ جہالت کے معنی نادانی کے ہیں۔ یہاں مجرم کی نفسیت بیان  
کی ہے کہ جرم کے ارتکاب کے وقت اس کے نتائج کا ذہن سے ذہول ہو گیا۔  
اور عقل سلیم غلبہ ہیمان نفس سے وقتی طور پر اندھی ہو گئی۔ علی اللہ اللہ کے ذمہ  
حقیقتاً تو اللہ پر واجب کوئی بھی چیز نہیں۔ یہاں قبول توبہ کو اللہ پر واجب تاکید  
کے معنی و مفہوم میں فرما دیا گیا ہے۔

مِنْ قَرِيبٍ، توبہ جتنی جلد کر لی جائے، یعنی غلبہ نفس اور مغلوبیت عقل کے  
وقت جو گناہ سرزد ہو جائے اس پر پشیمانی اور اس عقل سے باز رہنے کا عزم  
جس قدر جلد قائم کر لیا جائے، اتنے ہی قبول توبہ کے موقع زیادہ رہتے ہیں۔  
اور جتنی اس میں تدریق و تاخیر ہوتی چلی جائے گی، اسی قدر قبول توبہ کے امکانات  
بھی ضعیف ہوتے جائیں گے۔ لیکن شریعت نے عین شفقت و رحمت اور  
بندہ نوازی سے کام لے کر اس قرب کی مہماد عین حضور موت سے قبل تک  
دسیج کر دی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان اور متعدد مابین سے آیت کی شرح و تفسیر  
میں یہی منقول ہے۔



كَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وہ اپنے مرتبہ علم کے لحاظ سے خوب جانتا ہے کہ کون مخلص ہے اور دل سے توبہ کرنے والا ہے اور اپنی شانِ حکمت کے لحاظ سے مناسب غیر مخلص کو بھی رسوا کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دیتا۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۚ حَتَّىٰ  
إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْإِثْمَ  
وَالَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كَقَارِئِهِمْ لَنْ يَرْجَوْا  
أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (آیت ۱۸)

اور توبہ ان لوگوں کی نہیں جو برابر گناہ کرتے رہیں، یہاں تک کہ ان میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو، اور اس وقت وہ کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ (ان لوگوں کی) جو اس حال میں مرتے ہیں کہ وہ کافر ہیں ان کے لئے ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔  
یعنی قاعدہ اور ضابطہ ایسے لوگوں کی بخشش کا نہیں جو گناہوں میں ڈوبے رہتے ہیں اور انھیں کو اپنا شعار زندگی بنا لیا ہے۔ ان سے قبولِ توبہ کا وعدہ نہیں۔ باقی اگر کسی سے وہ غفور و رحیم و مغفیر ہی کا معاملہ کرنا چاہے تو اس کے فضل و کرم کی راہ میں کسی کی کیا مجال جو حائل ہو سکے۔

إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ، یعنی عالمِ ناسوت کے حدود شکست ہونے کے بعد، عالمِ غیب کا مشاہدہ ہونے لگے، تو اب توبہ اختیاری نہ رہے گی، بلکہ اضطراری بن جائے گی جو مقبول کسی درجہ میں بھی نہیں۔

آیت ماقبل میں السُّوء بِصِغَةِ وَاحِدٍ تھا۔ اور اب ”سَيِّئَاتِ“



(پصیفۃ جمع) آگیا۔ یہ فرق قابل غور و لحاظ ہے۔ پہلی آیت میں ذکر جلد توبہ کر لینے والوں کا تھا، اور اس دوسری آیت میں ان کا ہے۔ جو اپنے گناہوں کا بوجھ نفساً میں ڈوب کر برابر بڑھاتے جاتے ہیں۔

وَهُمْ كُفَّارٌ۔ کافر کی توبہ کا موت کے وقت غیر مقبول رہنا پہلی آیت میں شامل تھا۔ عجب نہیں کہ یہ مزید ناکید و مزید تفضیح کے لئے ہو۔





بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## پوتا خطبہ

—: (۲۰) :—

فطرت نے انسان کی تقسیم دو جنسوں میں، اس کی پیدائش کے ساتھ ہی رکھ دی ہے۔ نر اور مادہ، مذکر اور مؤنث، مرد اور عورت اور ان دونوں کے باہمی تعلق کا مسئلہ شروع سے نازک و پیچیدہ چلا آ رہا ہے۔ پرانی تہذیبیں تو زیادہ تر اس طرف گئیں کہ عورت ایک صنف حقیر و ذلیل ہے۔ مردوں کی محکوم اور باندی۔ بچپن بھر باپ کی قید میں رہے۔ بڑی ہو کر بھائی یا شوہر کی جگہ بن گئیں۔ اور آخر عمر میں لڑکوں کی کردی نگرائی میں۔ جدید تہذیب کا رد عمل اس کے ٹھیک برعکس اس حد تک ہوا کہ فوبت مادر پدر آزاد می کی آگئی۔ اب دیکھیے کہ قرآن اس مسئلہ کو کس حکیمانہ و عادلانہ نظر سے دیکھ رہا ہے۔ سعادۂ انسا، تو ہے ہی خالص عورتوں کے مسائل کے لئے، اس کی آیت ۳۲ ملاحظہ ہو:

ذَلَّا تَتَمَنَّوْنَ مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ ؕ

اور تم ایسے امر کی تمنا نہ کیا کرو، جس میں اللہ نے بڑائی دے رکھی ہے تم میں

سے ایک دوسرے پر۔

بڑائی سے مراد ہے طبعی اور ذہنی طور پر بلا دخل کسی عمل و کسب کے مثلاً کوئی دولت مند ہے، کوئی حسین و جمیل ہے، کوئی خوش گھوڑے، کسی کے قوائے جسمانی بڑے مضبوط ہیں، اس قسم کے طبعی و ذہنی فضائل کو قرب حق میں مطلق دخل نہیں، اور ان کی بناء پر ایک دوسرے پر رشک کرنا، ایک دوسرے کے مثل و مانند ہونے کی حسرت متنا کرنا



درست نہیں۔ قرب حق میں دخل صرف عمل و کتاب کو ہے، رحمت و مغفرت و قرب حق کا مدار تو اعمال و ارادی و اختیاری پر ہے۔

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ  
مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ (ثابت) ہے، اور عورتوں کے لئے  
اُن کے اعمال کا حصہ (ثابت) ہے۔

اور اس حیثیت سے مرد اور عورت کی حیثیت بالکل یکساں ہے۔ عورتوں کے لئے بھی قانون وہی ہے جو مردوں کے لئے۔ یہ فرق محض تکوینی مصلحتوں سے رکھ دئے گئے ہیں۔ ان میں رشاک و حسرت کا کوئی محل نہیں۔ یہ نہیں ہونے کا کہ مرد کا کچھ اجر اس کے مرد ہونے کی بنا پر بڑھ جائے، یا عورت کا کچھ اجر اس کے عورت ہونے کی بنا پر گھٹ جائے۔ ایک مکلف بشری مخلوق ہونے کی حیثیت میں اس میں اور مرد میں کوئی فرق نہیں۔ مرد، مرد ہونے کی حیثیت سے ہرگز اللہ کے ہاں مقرب تر اور نجات کا مستحق تر نہیں اور عورت ہرگز اپنی جنس کی بنا پر کسی اجر و قرب سے محروم نہ رہے گی۔ عورت اپنا احساس کنسری دور کرے اور سمجھ لے کہ وہ مرد سے فرزند تر مخلوق نہیں۔ جیسا کہ بعض دوسرے مذاہبوں نے قرار دے رکھا ہے۔

ہندوؤں نے اپنے منہ مگرتی کے ادراک میں اور کتھولک کلیسا نے اپنے جلسوں اور کونسلوں میں صدیوں تک جو فیصلے عورتوں کی پستی اور پست فطرتی کے کئے ہیں آیت ان سب کی تردید کرتی رہی ہے اور آگے ہے۔

وَأَسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (آیت ۲۲)  
اللہ سے اس کے فضل کی طلب کرو۔ بے شک اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔

چنانچہ اس نے اپنے علم کامل کے مطابق ہر مخلوق کو صلاحیت اور استعداد بخشی اور



وہی ہر ایک کی فرد عمل پر پوری طرح مطلع بھی ہے، تو اس کا فضل توفیق اعمال میں بے شک طلب کرتے رہو۔ رشک و تناد والی اور دعاؤں میں طلب کرنے والی چیز وہ وہی طبعی خصوصیتیں نہیں، بلکہ یہ نعمت توفیق حسن حاصل ہے۔

اور ایک آیت کے بعد آگے ارشاد ہوتا ہے :-

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ  
عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ (آیت ۳۳)

مرد عورتوں کے سر دھرے ہیں، اس لئے کہ اللہ نے انھیں ایک دوسرے پر بڑائی دی ہے، اور اس لئے کہ مردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے۔

یہ بیان کرنے کے بعد کرد و حیاتیات کی دنیا میں قرب حق و حسن عمل کے معاملہ میں مرد و عورت کی حیثیت مساوی ہے۔ نماز، روزہ، اور زکوٰۃ اور حج اور بہت سی عبادتیں جس طرح مردوں کے لئے کھلی ہوئی ہیں۔ اسی طرح عورتوں کے لئے بھی۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ مرد و زن کی یہ مساوات دیکھنا فی دنیوی معاملات میں انتظامی حیثیت سے قائم نہیں۔ دونوں جہتیں عہد بالکل ایک ہیں۔ اعمال کی قبولیت کے باب میں عناد بالکل ایک ہیں لیکن دنیا میں شریعت کا حکم ہے کہ باپ افسر ہو کر رہے، اور بیٹا ماتحت ہو کر، وہ حکم دے اور یہ حکم مانے، اب بتایا جا رہا ہے کہ معاشرت کی انتظامی مشین میں مرد کو عورت پر غلبہ و تفوق حاصل ہے۔ ”قَوَّام“ کے معنی ہیں کسی شے کے محافظ و منتظم، سربراہ ہونے کے مراد یہ ہے کہ عورتوں کے امور کا انتظام کرنے والے، ان کی کفالت کرنے والے، اور احکام کے نافذ کرنے والے ہیں۔

بائبل نے عورت کو کیا درجہ دیا ہے اس کا اندازہ ان عبارتوں سے کیجئے جو ابھی پڑھ کر سنار ہا ہوں :-

”خداوند خدا نے..... عورت سے کہا اپنے خیم کی طرف تیرا شوق ہوگا“



اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا، (پیدائش باب ۱، آیت ۱۶)

یہ عبارت عہد عتیق کی تھی یعنی تورات کی اس جدید یعنی انجیل کی بھی سنتے۔

”اے یو یو! اپنے شوہروں کی ایسی تابع رہو جیسی خداوند کی،

کیونکہ شوہر بیوی کا سر ہے، جیسے مسیح کلیسا کا سر ہے، اور وہ خود بدن کا

بچانے والا ہے، لیکن جیسے کلیسا مسیح کا تابع ہے ایسے ہی بیویاں ہر بات

میں اپنے شوہروں کی تابع ہوں۔“ (افسیون باب ۵، آیات ۲۲-۲۳)

قرآن حق کا کلام ہے اور ہمیشہ حق ہی کہتا ہے، وہ کلیسا کی کونساں اور منومنہ کی

کی طرح عورت کی تحقیر و تذلیل کا ہرگز قائل نہیں، لیکن ساتھ ہی جاہلیت قدیم اور

جاہلیت جدید سے بھی ہمدردی نہیں۔ وہ عورت کو ٹھیک وہی مقام دیتا ہے جو غلط

کائنات نے اسے نظام کائنات میں دے رکھا ہے۔ چھیت ایک عہد اور مکلف

انسان کے وہ مرد کے مساوی اور ہم سطح ہے لیکن دنیا کے انتظامی معاملات میں مرد کے

تحت و تابع ہے۔

آخر میں یہ طور اسباب قرآن نے دو باتیں بیان کی ہیں، ایک یہ کہ مرد کو عورت پر

فوقیت طبعی و تکوینی پسلو سے حاصل ہے۔

بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ، اور مرد کی یہ فضیلت اس کے ذوالے

جسمانی کی مضبوطی اور ذی دماغ کی برتری کے باعث ہے۔ اور دوسرے یہ کہ مرد جو عورت پر

مہر اور نفقہ کے سلسلے میں خرچ کرتا رہتا ہے۔

بِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ، یعنی مرد کو فضیلت دہری حاصل ہے۔

ایک تو طبعی یعنی جسمانی و دماغی قوتی میں خلقی برتری کے باعث دوسرے قانونی یا معاشرتی۔

یعنی عورت خرچ میں مرد کی دست نگر رہتی ہے۔ یہیں سے مسئلہ بھی نکل آیا کہ قرآنی نظام

میں کمانا یا کسب معاش کرنا یا بیوی کے خرچ کا بار اٹھانا مرد کے ذمہ ہے۔ قرآن اس



نظام معیشت کو پسند نہیں کرتا، جس میں کما کر لانے کی راہیں میاں بیوی دونوں کے لئے یکساں کھلی ہوئی ہوں۔

### — ﴿۴۱﴾ —

اس سیاق میں قرآن نے اسے بھی کھول کر بیان کر دیا ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ میں کس قسم کی بیویاں غاتوئیں چاہتا ہے۔

فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (آیت ۳۴)  
سو نیک بیویاں اطاعت کرنے والی ہوتی ہیں اور پیچھے پیچھے حفاظت کرنے والیاں اللہ کی عنایت سے،

سب سے شروع میں جو حشر آتا ہے یا بے معنی نہیں۔ ق کے معنی ہیں ”نتیجہ“ یعنی اوراد پر کے مفدمات سے یہ نتیجہ لازم آجاتا ہے کہ وہ نیک بیویاں ایسی ہوں کہ کیسی ہوں؟ پہلی بات یہ کہ وہ اللہ کی فرمانبرداری اور عبادت گزار ہوتی ہیں شوہروں کی بھی فرمانبرداری و اطاعت گزار ہوں۔ مساوات کے نعرے لگانے والیاں ہوں۔ اور دوسری بات یہ ہوتی ہے کہ شوہروں کی غیبت میں ان کی عزت و ناموس کی اور ان کے مال و اولاد کی حفاظت کرنے والیاں ہوں۔

یہ حال تو ہوا شریف، شائستہ، منہذب بیویوں کا، جیسا کہ ہونا چاہیے۔ اب میں ناشائستہ اور رذیلی فطرت والیاں تو ان کی بھی جھلک دیکھ لیجئے:

وَالَّتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ  
فِي الْمَضَاجِعِ وَاصِرُّوهُنَّ ۝

اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم ان کی سرکشی کا علم رکھتے ہو تم انھیں نصیحت کرو، اور انھیں خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو اور انھیں ارد،



یہاں آیت میں جو لفظ خوف آیا ہے (تَخَافُونَ نَشُوزَهُنَّ) تو یہاں اس  
 مراد محض مشہور یا گمان نہیں بلکہ یہ ہے کہ جب ان کی بغاوت و نافرمانی تجربہ میں آجائے  
 ابن عباسؓ صحابی کی تفسیر خوف بمعنی علم آیا ہے۔ تخافون اسی تعلمون  
 اور دوسرے اہل تفسیر بھی اسی طرف گئے ہیں کہ محض بدگمانی کافی نہیں بلکہ واقعی تجربہ قصور کا  
 ہونے۔ اور نشوز کے معنی یہ ہیں کہ بیوی شوہر کی نافرمانی پر کمر بستہ ہو جائے۔ جب  
 پُر مسرت از دواجی زندگی کا گھر بغاوت و تصادم کا تماشا گاہ بن جائے، تو اس وقت  
 کے لئے پہلا حکم ہے کہ عِظُوهُنَّ انھیں سمجھاؤ، وعظا دیندے سے کام لو، عورت اگر شریف  
 عیلت ہے تو یقیناً ہے کہ اس نرمی و آشتی کے طریقے سے علاج پر آجائے گی اور اس ضمن  
 میں یہ ہدایت بھی مل گئی کہ غصہ میں آکر کوئی فوری کارروائی نہ کر بیٹھو۔ لیکن جب یہ تدبیر کارگر  
 نہ ہو تو اب ٹلی قدم یہ اٹھاؤ کہ ترک ہم بستری کرو۔ بلکہ ہجر کے معنی یہاں ابن عباسؓ صحابی  
 اور متعدد تابعین سے ہجر الکلام منقول ہیں۔ یعنی ترک کلام۔ ان سے بولنا چھوڑ دو  
 اور جب سزا کا یہ دوسرا درجہ بھی ناکام رہے، تو انھیں جسمانی آزار پہنچا سکتے ہو۔ یہ  
 آخری تدبیر صرف آخری درجہ میں ہے۔ جب پہلے دونوں علاج تجربہ کے بعد  
 ناکام ثابت ہو لیں۔ اور اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ یہ بار بالکل ہلکے قسم کی ہو  
 جس سے نہ چوٹ زیادہ آئے اور نہ اس سے رفیق زندگی کی کمی توہین لازم آئے۔  
 بلکہ مفسر صحابی ابن عباسؓ کی تو رائے ہے کہ یہ مار سواک کی سی ہلکی پھلکی چیز  
 سے ہو۔ قرآن مجید کا خطاب ظاہر ہے (لیکن بار بار یاد کر لینے کی ضرورت ہے۔)  
 کسی ایک طبقے سے، کسی ایک بلندی ترقی پر پہنچی ہوئی قوم سے نہیں، اس کے مخاطب  
 ایک ہی وقت عرب، روم، ہند، مصری بھی، اور حبشی و چینی بھی، امریکی و افریقی  
 بھی، بڑے سے بڑے شریف بھی اور انتہائی رذیل بھی، چار اور چھوٹے بھی، عالم  
 وفیم بھی، جاہل و کورن بھی، ہر طبقہ، ہر ذہنیت، ہر اخلاقی و عقلی سطح کے لوگ



پہلی صدی ہجری سے لے کر قیامت تک، ہر زمانہ اور ہر سطح تمدن والے ہیں، اور اس لئے اس کے احکام میں احاطہ ہر انسانی اور ہر بشری ضرورت کا کر لیا گیا ہے اور یہ مشاہدہ ہے کہ آج بھی تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی ایسے طبقے اور معاشرے موجود ہیں جہاں عورت کے لئے گالی گلوچ اور جسمانی سزائیں عام ہیں۔ مار پیٹ کوئی نادر الوقوع واقعہ نہیں، پھر انھیں بھی اس کی اجازت ضرورت پڑنے ہی پر ہے۔ فقہائے اُمت نے صاف کہہ دیا ہے کہ نرم تدابیر اگر کام دے جائے تو سخت صورت کی اجازت نہیں۔ اور قرآن مجید کا سیاق بھی نرمی ہی کی سفارش کر رہا ہے۔ یورپ میں جہاں میاں بیوی کی مار پیٹ کا رواج ہے۔ اس کا ذکر خاکسار کی انگریزی تفسیر میں موجود ہے۔ قرآن مجید میں اس اجازت کا موجود ہونا ہرگز اس کے حق میں مضرت نہیں بلکہ یہ تو عین دلیل ہے اس کی کہ قرآن مجید کے احکام ہر طبقہ، ہر مزاج، ہر سطح انسانی کے لئے تھے اور ہیں۔

### —: (۲۲) :—

مصلو بہت شیح کی بحث قرآن مجید کی اہم بحثوں میں ہے۔ اور مسیحیت کے عقیدہ واختلافات نے اسے اہم تر بنا دیا ہے۔ اس کے سمجھنے اور گنتھی کے پوری طرح سلجھنے میں ذرا وقت لگے گا۔ لیکن یہ وقت ان شاء اللہ ضائع نہیں ہوگا۔ بس ذرا صبر و تدبیر سے سماعت فرمائیں۔

قرآن مجید نے اسے کسی مستقل عنوان کے ماتحت نہیں بلکہ بنی اسرائیل کی ایک لمبی فہرست جرائم میں محض ضمتاً بیان کر دیا ہے۔ اور پورا مضمون ایک آیت میں نہیں، دو تین آیتوں میں آیا ہے۔ سورۃ النساء کا بابیسواں رکوع کھولی کر ملاحظہ کیجئے، دو لمبی آیتوں میں قوم اسرائیل کی تاریخی نافرمانیوں اور مسلسل سنگین جرموں کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔



فِيمَا نَقَضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ وَكَفَرِهِمْ بِآيَاتِ اللَّهِ وَقَتْلِهِمُ  
الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ  
اللَّهُ عَلَيْهِمْ بِكَفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (آیت ۱۵۵)

سو ہم نے انھیں سزا میں مبتلا کیا، پسبب ان کی عدم شکنی کے، اور یہ سبب  
آیات الہی سے ان کے کفر کے، اور پسبب ان کے خون ناحق انبیاء کے  
اور پسبب ان کے اس قول کے کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں (نہیں) بلکہ  
ہے یہ کہ اللہ نے ان ہر ہر لگا دی ہے یہ پسبب ان کے کفر کے، سو وہ ایمان  
نہیں لائے مگر بہت تھوڑا سا۔

اور وہ تھوڑا سا ایمان، ناقص، نامکمل، لغوی معنی میں جو ہے، وہ مرتبہ ایمان شرعی کے لئے  
کافی نہیں۔

وَبِكَفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا ۝ (آیت ۱۵۶)

اور پسبب ان کے کفر کے اور پسبب ان کے قول کے مریم پر بہتان عظیم کے۔

یعنی اور سب تو ان کی نافرمانیاں چل رہی تھیں، اب اس میں اضافہ انھوں نے یوں کیا کہ اس  
پاک سرشت مریم بنت عمران پر ایک سخت گندہ الزام لگا دیا، قرآن مجید نے اس گندہ الزام  
کی طرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا، باقی یہود کی کتابوں میں تو اس شرمناک جرم کی صراحت  
آج تک لکھی چلی آ رہی ہے۔ یہود کی لکھی جو قدیم ترین کتاب ہے

کے نام سے عبرانی میں موجود ہے، اس کا انگریزی ترجمہ ACCORDING

TO HEBREWS کے نام سے چھپ چکا ہے، اس میں اس رومی پساری کا نام

تک دیا ہے جس کے ساتھ نعوذ باللہ آپ کو شتم کیا ہے اور یہ نام بیسویں صدی کی ایک کتاب

جوزف کلازنگ *Joseph Klausner* کی *LIFE OF JESUS* تک میں

نقل ہوا ہے۔



والدہ مسیح پر بہتان عظیم کے بعد قرآن مجید کہتا ہے ان کی مسلسل سزایابی کے لئے کہ  
 وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ (آیت ۱۵۷)  
 اور یہ سبب ان کے اس قول کے کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو مار ڈالا جو اللہ کے  
 پیغمبر تھے۔

اس وقت یہود اس کو اپنی ہی جانب منسوب کرتے تھے، اور اس کو اپنا ایک  
 پُر غر کار نامہ سمجھتے تھے۔ حکومت اس وقت ملک پر گویہودی نہیں، رومیوں کی تھی۔  
 فوجداری عدالتیں بھی انھیں کی تھیں، سزا دینے اور سولی پر چڑھانے کا اختیار بھی یہود کو  
 نہیں، انھیں کو تھا، یہود تو عام رعایا کی طرح تھے۔ لیکن قرآن مجید نے یہ قول منسوب انھیں  
 کی جانب کیا۔ مقدمہ عدالت میں یہود ہی لائے۔ گواہ استغاثہ کی طرف سے یہود ہی پیش  
 ہوئے، اور آپ کو سزا دلوانے میں پوری سعی یہود ہی نے کر ڈالی، بلکہ جب سزا دینے میں  
 رومی حاکم عدالت پلاٹس *Platters* مذہب ہونے لگا تو شور و شر اس کے  
 خلاف برپا کر کے اسے سزا دے موت سنانے پر مجبور کر دیا۔

انجیل متی میں ہے:

”جب پلاٹس نے دیکھا کہ کچھ نہیں بن پڑتا، بلکہ اکتا بلرہ ہوا جاتا ہے

تو پانی لے کر لوگوں کے رو برد اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا کہ میں راست بلو کے

خون سے بڑی ہوں، تم جانو۔ سب لوگوں نے کہا کہ اس کا خون ہماری اولاد کی

گردن پر اس پر اس نے برا بکوان کی خاطر چھوڑ دیا۔ اور یسوع کو کوڑے

لگا کر حوالہ کیا تاکہ صلیب دی جائے۔ (باب ۲۷، آیات ۲۲-۲۶)

اس سے ملتے جلتے بیان انجیل مرقس وغیرہ کے ہیں، اور انجیل لوقا میں تو صریح

بھی موجود ہے کہ:-

”مگر پلاٹس نے یسوع کو چھوڑنے کے ارادے سے پھر ان سے کہا، لیکن



وہ چٹا کر بولے کہ اس کو صلیب دے۔ صلیب ! اس نے تیسری بار ان سے کہا، کیوں ؟ اس نے کیا بُرائی کی، میں نے قتل کی کوئی وجہ نہیں پائی اور میں اسے پٹا کر پھوڑے دیتا ہوں۔ مگر وہ چلا چلا کر سر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے، ان کا چلا ناکارگر ہوا۔ پلاٹس نے حکم دیا کہ ان کی مرضی کے موافق ہو..... یسوع کو ان کی مرضی کے موافق سپاہیوں کے حوالہ کیا۔ (باب ۲۲، آیت ۲۱-۲۵)

اور انھیں یہود سرداروں اور عالموں ہی نے توشیح کو عدالت تک پہنچایا تھا۔ انجیل مرقس میں ہے :-

”اور فی الفور صبح ہوتے ہی سردار کاہنوں نے بزرگوں اور فقیہوں اور سارے عدالت والوں سمیت صلاح کر کے یسوع کو بندرھوایا اور لے جا کر پلاٹس کے حوالہ کیا۔“ (باب ۱۵، آیت ۱)

اور خود انجیلوں میں جو پیش خیریاں حضرت شیخ کی زبان سے اپنے قتل یا شہادت کی بابت ہیں ان میں بھی سبقت اور پیش قدمی یہود ہی کے سرداروں کی دکھائی ہے، رومی یا رومی حکومت کا نام بھی نہیں لیا ہے۔

انجیل متی میں ہے :-

”اس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور ہے کہ میں یروشلم کو جاؤں اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے بہت دکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں“ (باب ۱۶، آیت ۲۱)

اور انجیل مرقس میں ہے :-

”پھر وہ انھیں تسلیم دینے لگا کہ ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے

اور بزرگ اور سردار اور فقیہ اسے روکیں اور اسے قتل کیا جائے“ (باب ۱۰، آیت ۳۲)

اور انجیل لوقا میں ہے :-



”ضرور ہے کہ ابن آدم دکھا اٹھائے، بزرگ اور سردار کا بن اور فقیر

اسے رد کریں اور وہ قتل کیا جائے۔“ (باب ۹- آیت ۲۳)

تو درحقیقت یہ قرآن کی انتہائی حقیقت سنجی کا ثبوت ہے کہ اگرچہ مقدمہ پیش ہوا ہمدی عدالت میں اور ہمدی ہی عدالت نے آپ کو سزا دے موت کا حکم سنایا، لیکن قرآن مجید نے مجرموں میں صرف یہود کا لیا کہ حقیقت میں ان ہی کا ہاتھ قدم قدم پر کام کر رہا تھا۔ یہود کا فخر یہ قول کہ ”ہاں ہم ہی نے عیسیٰ بن مریم کا کام تمام کر ڈالا“ ابھی ابھی نقل ہوا ہے اب دیکھیے قرآن ان کے اس قول پر کیا تبصرہ کرتا ہے،

وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ

”حالانکہ وہ نہ آپ کو مار ڈال سکے، نہ آپ کو سولی پر چڑھا سکے، بلکہ ان پر شبہ

ڈال دیا گیا۔“

یعنی آپ کا کام تمام کر ڈالنا تو الگ رہا (وَمَا قَتَلُوهُ) وہ تو آپ کو سولی پر بھی چڑھانہ پائے۔ (وَمَا صَلَبُوهُ) اور اس آخری فقرہ کے اگر یہ معنی لیے جائیں کہ ”آپ کو سولی پر نہ مار سکے“ تو آپ کی ہلاکت کی نفی سرے سے پہلے ہی فقرہ میں کر دی ہے تو یہ دوسرا فقرہ صلیب پر مار نہ سکے بالکل بے کار یا حشو ہوا جاتا ہے یعنی جب آپ کسی کو کسی طرح نہ مار سکے تو اس میں سولی دینا بھی شامل ہو گیا۔ پھر اب اس کے دہرانے کی کیا ضرورت تھی، اور قرآن مجید حشو سے بالکل پاک ہے۔ صَلَبُوهُ کا اصل مفہوم محض سولی پر لٹکانے یا چڑھانے کا ہے۔ چڑھا کر ختم کر دینے کا نہیں۔ امام لغت الغیب کے مفردات میں ہے تغلیق الانسان للقتل انسان کو ہلاکت کے لئے ٹھکانا دینا اردو میں یہ مفہوم ”سولی دینے سے نہیں“ سولی پر چڑھانے“ ہی سے ادا ہوتا ہے۔ اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے فارسی ترجمہ اور شاہ عبدالقادر دہلوی اور حضرت تھانوی کے اردو ترجموں میں اس کی رعایت موجود ہے۔



حضرت مسیح کے ملک اور زمانے میں سرکاری سزائے موت کے لئے طریقہ ہی صلیب پر چڑھانے کا نافذ تھا۔ تو قرآن کہتا ہے کہ یہود آپ کو ہلاک تو کیا کہتے، سولی پر چڑھانے پر بھی قادر نہ ہو سکے۔ بلکہ دھوکے میں پڑ گئے۔ اور حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی۔ یہ شبہ میں کیوں پڑ گئے؟ یا حقیقت کس پر مشتبہ و مختلط ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ وہی یہودیابی اسرائیل مراد ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ مارک میں ہے وقع علیہم الشبهہ اور یضاد میں ہے التبس علیہم الامر۔ یا یوں کہا جائے کہ شبہ انھیں مقتول سے متعلق ہوا یا اس کی شخصیت کے بارے میں وہ دھوکے میں پڑ گئے۔ جلالین میں ہے شبهہ لهم المقتول والمصلوب۔

قرآن نے اس اشتباہ یا التباس کو خوب ہی مؤکد کیا ہے؛ اور نفی ہلاکت کو ایک بار پھر صراحت سے دہرایا ہے:

وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوا يَقِينًا ۚ (آیت ۱۰)

اور جو لوگ آپ کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں اور آپ کی طرف شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے پاس کوئی علم (صحیح) تو ہے نہیں۔ ان سبب یہ گمان کی پیروی ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ انھوں نے آپ کو ہلاک نہیں کیا۔

غرض اس پر ہمارے سارے مفسرین کا اتفاق ہے کہ دھوکا یہود کو ہوا اور وہ حضرت مسیح کے بھائے کسی اور کو سولی پر دیے گئے۔ یہ شخص کون تھا؟ اور اس دھوکے کی کیا صورت ہوئی؟ اور ایک بڑے مجمع کے سامنے یہ دھوکا ممکن کیونکر ہوا؟ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا تصریحی جواب نہ قرآن مجید میں ہے، نہ حدیث صحیح میں۔ سادہ دل مسلمان کو تو محض اس صورت حال پر جو کہ یہاں بیان ہوئی ہے، ایمان لے آنا کافی ہے اور چون و چرا میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن آج کے طالب علم کو جو فکر کیسے اور کیونکر کی پیدا ہوئی



اس کی تسکین کے لئے لازمی ہے کہ اس تاریخی گریہ کا جواب تاریخ ہی کی روشنی میں دیا جائے۔  
واقعے کے ایک ایک جزئیہ کو سامنے لے لیا جائے۔ اور جو صورت واقعہ سبب سے زیادہ  
قرین قیاس اور مطابق مقتضائے حال ہو۔ اس کو اللہ کا نام لے کر ترجیحی طور پر اختیار کر لیا  
جائے۔ کڑی کا سلسلہ کڑی سے اُکھٹنے نہ پائے۔ اس کے لئے کچھ دیر کے صبر و سکوت  
کی درخواست ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات تو بس سلسلے میں یاد رکھنے کی یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ یرود سلم  
کے لوگوں سے ملنے جلتے کم تھے۔ آپ کی کم آسیر ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ غوام تو غوام خواص بھی  
آپ کو پوری طرح پہچانتے نہ تھے۔ چنانچہ آپ کی گرفتاری کے وقت اکابر یہود اور متعدد  
سپاہیوں کا گروہ شناخت کے لئے کافی ثابت نہ ہوا، بلکہ آپ کی شناخت کے لئے آپ ہی  
کی مختصر پارٹی سے ایک غدار کو نوڈ لینا پڑا۔ یہ حقیقت ہے تو خاص تاریخی، لیکن کرامت  
دیکھیے کہ آپ کے امام مفسرین امام رازی (جن کا زمانہ ساتویں صدی ہجری کے شروع کا)  
اس راز سے واقف نکلے، چنانچہ لکھتے ہیں:

والناس ما كانوا يعرفون المسيح الا بالاسم لانه  
كان قليل المخالطة بالناس (کبیر)

لوگ حضرت عیسیٰ کو تو بس نام ہی سے جانتے تھے۔ ان کی کم آسیر ہی کی بنا پر۔

مستی اور مرقس دونوں انجیلوں میں ہے کہ گرفتاری کرنے والی پارٹی میں سردار کاہنوں اور قوم  
کے بزرگوں کی طرف سے ایک بڑی بھیڑ نکلا رہی اور لاکھیاں لئے ہوئے سپاہیوں کی  
شامل تھی۔ اس پر بھی گرفتاری اور شناخت کے لئے انھیں یہود و منافق کا سہارا دھونڈنا  
پڑا۔ اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب یہ پلٹن اور پیادے وہاں پہنچے تو۔

”یسوع نے ان سے پوچھا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو تو وہ بولے یسوع باصری کو۔

یسوع نے جواب دیا کہ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں ہی ہوں (کتاب اہلبیت)



حضرت سچی کا یہ عظیمی تخیل تو بہت بعد کی پیداوار ہے، معاصر مخالفین و معاندین کے نزدیک تو آپ کی حیثیت بس ایک بدنام و غیر متعارف مجرم کی تھی، وہ سامنے موجود تھا، اور اپنے کو چھپا بھی نہیں رہا تھا۔ ظاہر کر رہا تھا۔ اس پر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا۔ حالانکہ سب آئے تھے اسی کی تلاش میں۔

(۲) دوسری بات یہ خیال رکھنے کی ہے کہ بہ طور خرق عادت یا بطور کمال فن حضرت کو تبدیل ہیئت میں خاص ملکہ تھا۔ انجیلوں میں اس خصوصیت کو بہ طور معجزہ بیان کیا گیا ہے۔ انجیل متی میں ہے:

”چھ دن کے بعد یسوع نے پطرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا اور انھیں ایک اونچے پہاڑ پر لے گیا۔ اور ان کے سامنے اس کی صورت بدل گئی۔ اور اس کا چہرہ سورج کے مانند چمکا“ (باب ۱۷، آیت ۲)

اور انجیل لوقا میں ہے:-

”جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرے کی صورت

بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید براق ہو گئی۔“ (باب ۹، آیت ۲۹)

(۳) تیسرے اس حقیقت کا بھی استحضار کر لیا جائے کہ ملک فلسطین کی آبادی،

اس وقت اسرائیلیوں (یہود) کی تھی۔ عام رعایا یہی لوگ تھے۔ لیکن ملک کی حکومت

رومیوں کی تھی۔ اور متحدہ دار اور پولیس اور فوج رومیوں پر مشتمل تھی، اور رومی نہ صرف

مذہباً مشرک تھے، عقیدے میں اسرائیلیوں سے مختلف، بلکہ شکل و شمائل، قیافہ اور

چہرہ مہرہ، وضع و لباس، زبان و معاشرت ہر چیز میں یہود سے ایسے ہی مختلف تھے

جیسے ابھی کل تک انگریز ہندوستان میں رہنے کے باوجود، ہندوستانیوں سے تھے۔ اور

جس طرح ہندوستانیوں کو سب گورے بھان مسلم ہوتے تھے، اور جس طرح گوروں کو

سارے کالے ایک نظر آتے تھے، اسی طرح سب بدیسی رومیوں کو کل اسرائیلی ایک ہی سے







اس ساری صورت حال کو اس تفصیل کے ساتھ نظر کے سامنے لا کر خود سوچئے کہ  
 مددی سپاہی جو حاکم قوم کے افراد تھے اور مجرم کو اپنی حراست میں لئے ہوئے تھے۔ انھوں  
 نے اس موقع پر کیا کیا ہو گا؟۔۔۔۔۔ خود اپنے اوپر تو وہ نئی کا بوجھ لادنے سے ہے۔  
 انھوں نے وہی کیا جو ایسے موقع پر کوئی ان کا سا انسان کرتا۔ انھوں نے راہ ہی میں  
 کسی بدتمیز یہودی کو پکڑ لیا اور صلیب والی لکڑی اس پر لاد دی۔ یہ محض قرینہ ظن قیاس  
 نہیں۔ انجیلوں میں اس کی تصریح ملتی ہے۔

”انھیں شمعون نامی ایک کرہنی آدمی ملا۔ اسے بیکار پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے۔“

(متی باب ۲۷، آیت ۳۱)

ایک حوالہ یہ ہوا، دوسرا اور لیجئے:-

”اور شمعون نامی ایک کرہنی آدمی، سکندر اور اوفس کا باپ، دیہات سے  
 آئے ہوئے ادھر سے گزرا۔ انھوں نے اس کو پکڑ لیا کہ اس کی صلیب اٹھائے“ (مرقس ۱۶: ۳۱)

تیسرا حوالہ اور ملاحظہ ہو:-

جب اس کو لئے جاتے تھے تو انھوں نے شمعون نامی ایک کرہنی جو دیہات سے

آتا تھا پکڑ لیا، صلیب اس پر رکھ دی کہ سیوٹ کے پیچھے پیچھے چلے (لوقا ۲۳: ۲۶)

اچھا، اب جب یہ عوام الناس کا ہجوم اس افراد قفری کے ساتھ ایک دوسرے کو

رہنما پیلتا، مجرم سے چھیر خافی کرتا، اس سے مسخر کرتا، سولی گھر کے پھانک پر پہنچا، تو رومی

پولیس کا جو گارڈ ہمراہ تھا، اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ اب غل و غل جیل کے واردوں سنتریوں کا

شرع ہوا۔ وہ کیا جانے کہ سیوٹ ناصر ہی کس کا نام ہے، خدائی یا پمیری کا وہ خود یاد رکھ رہا ہے۔

وہ مجرم حسب دستور اس کو سمجھے جس کی پشت پر صلیب لادی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر اس نفسیاتی

حقیقت کا استحضار کر لیجئے کہ جیل کے رومی سنتریوں کے لئے سب اسرائیلی اجنبی ہی تھے۔ اور اس

لئے سب آپس میں شک، ان کے لئے ایک اسرائیلی (یسوع ناصر) اور دوسرے اسرائیلی



(شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ بالکل قدرتی تھا۔ انھیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق محسوس ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ شمعون نے یقیناً داد دیا مچایا ہوگا، لیکن اوطھر هجوم کا شور و ہنگامہ، اوطھر رومی سنتریوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت اور کھپر سولی پر چڑھا دینے کی جلدی، اس آفراتفری کے عالم میں شمعون اسرائیلی کو مجرم سمجھ کر سولی پر چڑھا دیا کیا۔ وہ چھٹا چلا تار رہا۔ اور حضرت مسیح اس ہڑ بونگ میں یقیناً رہا ہو گئے، اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ہلاک ٹوٹیں اترے رہے وَلٰكِنْ شَيْئَهُمْ کی تفسیر اس سے بڑھ کر روشن تر اور کیا ہوگی۔

آخر میں یہ بھی سن لیجئے کہ یہ عقیدہ بالکل نواہجہ نہیں، خود مسیحیوں ہی کا ایک قدیم فرقہ باسلیدیہ (Basildian)۔ (بانی فرقہ کا سال وفات سن ۱۱۰) اس عقیدہ کا قائل ہوا ہے، اور کھلم کھلا کہتا تھا کہ مصلوب حضرت مسیح نہیں ہوئے، بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے۔

قرآن مجید اس عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ لیکن پولوس (متوفی سن ۶۵ء) کے اثر سے جو مسیحیت چلی اور پھیلی، اس کی بنیاد ہی عقیدہ کفارہ پر ہے یعنی اس پر کہ ابن اللہ نے، یا خود خدا نے مجسم ہو کر، اور مصلوب ہو کر بانگنی کی تکلیف اٹھا کر، اور اپنی جان دے کر ساری گنہگار مخلوق کی طرف سے کفارہ ادا کر دیا۔ اس لئے رواجی مسیحیت تو بغیر مصلوبیت مسیح کے ایک قدم کے ایک قدم بھی آگے نہیں چلی سکتی۔ اور اسی لئے لامحالہ اس پولوسی اور تمام تریلیشی مسیحیت میں کل قدیم تر اور صحیح عقیدہ مسیحی فرقوں کو "مبتدع" و بدوین قرار دے کر دائرہ مسیحیت سے القط کر دیا، اور خود ہی کہنے لگے جو دشمنان مسیح یعنی یہود پہلے ہی سے کہہ رہے تھے یعنی کہ عیسیٰ مصلوب پر وفات پا گئے۔ گویا ہرے کہ اس اشتراک عقیدہ میں ہمیں دونوں کی بالکل الگ الگ ہیں۔ یہود بلا کت مسیح کو موقع تحقیر و ابانت پر بیان کرتے ہیں، اور مسیحی بنفسہ اس واقعہ کو آپ کی غلطی بلکہ



الوہیت پر دلیل لاتے ہیں۔ نفس و فانی بہر حال دونوں میں مشترک ہے۔

سچ کا قرآن نے کہ مسیح کے بارے میں یہ لوگ یعنی اہل کتاب آپس کے اختلافات میں پھٹے ہوئے ہیں، کوئی آپ کو عرش الوہیت پر بٹھائے دیتا ہے اور آپ کی خدائی کا کلمہ پڑھ رہا ہے، کوئی مرتبہ نبوت بلکہ ولایت و تقویٰ سے کبھی نیچے اُتار دیتا ہے اور آپ کو نعوذ باللہ شعبہ باز قرار دے رہا ہے اور قرآن نے یہ جو آپ کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ۔ تو شک کی بہترین تفسیر مفسر تھانویؒ نے کی ہے: قول بلا دلیل، یہ قول بلا دلیل ہی کی برکت تو ہے کہ نظریہ پر نظریہ قائم کرتے چلے جاتے ہیں، اور کوئی بات بنائے ہیں جتنی مسیحی مسیحوں کی دست گریبان میں، اور یہودیوں کے۔ دیکھتے دیکھتے اندر رہی اندر خدا معلوم کتنے فرقے نکل آئے ہیں، ایک دوسرے کو جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں۔

چوں نہ دیدند حقیقت ارہ افسانہ زدند

اسی موقع کے لئے ہے۔ مَا لَیْسَ بِدِّ مِّنْ عِلْمٍ، اور علم سے مراد علم ثابت بالدلائل ہے۔ تحقیق سے بھی دسی کی مثال اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ نہ کوئی نص اسکی خیال رائیوں کی پشت پر ہے، نہ کسی نص سے استنباط صحیح۔ إِلَّا اتِّبَاعَ الظُّلُمِ، ظن یہاں مقابل میں علم کے ہے۔ یعنی کوئی دلیل نہ عقل نہ نقلی۔

وَمَا قَتْلُوهُ یَقِیْنًا۔ مار گئے لے کر جلا لیں تک سب کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ فقرہ نفی قتل و ہلاکت کی تاکید کے لئے ہے۔ چوں کہ عقیدہ وفات مسیح یا قتل مسیح بہت بڑی گمراہی کا باعث ہے۔ اور دنیا کے دو بڑے مذہب جیت اور یہوئیت اسی غلط عقیدہ میں پڑے ہوئے ہیں، اس لئے قدس قرآن کو ضرورت تھی اسکی تردید لکھی، اس وضاحت و تاکید کے ساتھ پیش آئی۔



## —: (۴۳) :—

قرآن مجید نے عقیدہ کے سلسلہ میں بڑا زور تسلسل دیا ہے اور یہاں سے لے کر اسلام دنیا کے لئے کوئی جدید یا نو پیدا مذہب نہیں ہے۔ اور نہ رسول اسلام دنیا میں پہلے شخص ہیں جن پر وحی آئی ہے۔ بلکہ نزول وحی کا سلسلہ دنیا میں بہت قایم رہے چلا آ رہا ہے اور دنیا کے مختلف جہتوں میں اور مختلف زمانوں میں پیغمبر برابر پیدا ہوتے ہی رہے ہیں جنہوں نے اللہ کے کلام کی منادیاں کی ہیں، اور اللہ کا کلام بندوں تک پہنچا یا ہے جتنا پھر اسی سورہ نساء میں بڑے زور اور صفائی کے ساتھ اس مضمون کو بیان کیا ہے اور نبیوں کے نام تک صراحت سے دئے ہیں، ارشاد ہوتا ہے :

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالْمُوسَىٰ  
مِنْ بَعْدِهِ ۖ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ  
وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ ۖ وَعِيسَىٰ ۚ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَ  
هَارُونَ ۖ وَسُلَيْمَانَ ۚ وَآتَيْنَا دَاوُدَ ذِكْرًا ۚ (آیت ۱۷۳)

یقیناً ہم نے آپ پر (اسے پیغمبر) وحی بھیجی جیسی وحی ہم نے نوحؑ اور ان کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیجی تھی، اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ اور عیسیٰؑ اور ایوبؑ اور یوسفؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ پر بھیجی۔ اور ہم نے داؤد کو ایک صحیفہ دیا تھا۔

روئے سخن زیادہ تر یہودی کی جانب سے ہے اور عقلاً بحث انہیں پر قائم کی ہے کہ جب تم حضرت نوحؑ کے بعد بہت سے نبیوں کو جانے ہو اور مانتے ہو اور نظام وحی کے پوری طرح قائل ہو، تو ایک نئے نبی کی شناخت و معرفت سے تمہیں اتنی وحشت اور دشواری کیوں ہو رہی ہے۔ نبیوں کے نام لینے کے بعد ذکر ہے :



وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ

نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا (آیت ۱۴۴)

اور دوسرے پیبروں پر بھی وحی بھیجی تھی کہ ان کا حال ہم آپ سے پیشتر بیان کر چکے ہیں، اور ایسے پیبروں پر بھی کہ ان کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا، اور موسیٰ سے اللہ نے خاص طور پر کلام فرمایا۔

اس میں اس بات کا اثبات ہے کہ ایسے پیبر بھی ہوئے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا ہے۔ اور ہمیں سے یہ مسئلہ ہمارے متکلمین نے اخذ کیا ہے کہ ہر ہر نبی پر تفصیل کے ساتھ نام بہ نام ایمان لانا ضروری نہیں، بلکہ سب نبیوں کی اجمالی تصدیق ضروری ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر جس انداز کے ساتھ آیا ہے یعنی فعل کے بعد پھر اسی مصدر کو لانا، وہ بھی تنوین کے ساتھ عربی کے اسلوب بلاغت کے مطابق، اس سے کلام کی کوئی خامی حیثیت اور خصوصیت رکھتا تھا۔ ورنہ محض کلام و مخاطبہ تو عام معنی میں ہر ہر نبی کے ساتھ ہوتا ہے۔

رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى

اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ مُكْذِبًا حَكِيمًا (آیت ۱۴۵)

پیبروں کو (ہم نے بھیجی) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے

(بنا کر) تاکہ لوگوں کو پیبروں (کے آنے کے) بعد اللہ کے پاس غدر باقی

نہ رہ جائے، اور اللہ تو ہے ہی بڑا زبردست، بڑا حکمت والا۔

ان پیبروں کے آنے کی غرض و غامت یہی معلوم ہوتی ہے کہ نیکی اور اجر و ثواب کے، اور بدی و عذاب کے راستے لوگوں کے علم و نظر میں رکھیں، اور وحی الہی کی روشنی میں انھیں وہ دس دین جہاں تک عقل و دانش کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور پیبروں کے آجانے کے بعد اب کسی کو قیامت میں یہ عذر پیش کرنے کا موقع نہ رہا کہ ہماری عقل مسائل و حقائق کے سمجھنے سے قاصر تھی۔ اور متکلمین نے ہمیں سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ بندوں پر حجت اللہ کی طرف سے



ارسالِ رسل اور بعثتِ انبیاء کے بعد ہی قائم ہوتی ہے نہ کہ مجرّد عقل و فہم کی بنا پر۔  
چنانچہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں اسے تکرار کے ساتھ لکھا ہے۔

اور اخیر آیت میں جو دو خطاب الہی عَزَّوَجَلَّ و حَکِیْمٌ آئے ہیں، تو یہ یاد دلانے کے لئے کہ وہ سزیز یا غالب کل تو، مالک و مختار اور فاعل حقیقی کی حیثیت سے حق اور اختیار رکھتا تھا کہ پیغمبروں کے بھیجے بغیر ہی، ہر عذر قطع کر دیتا۔ لیکن اس حکیم کی شانِ حکیمانہ نے یہ چاہا کہ وہ ظاہری عذر بھی باقی نہ رہنے دے۔

### —: پیچ (۴۴) :—

یہود کے ذکر سے فارغ ہو کر ختم سورہ کے قریب ایک بار پھر اثباتِ توحید و تردیدِ تشکیک کے مضمون کو از دور و قوت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہود جس طرح تفریط کے مریض ہیں، عیسائی افراط کی انتہا پر پہنچ گئے تھے۔ اور حضرت عیسیٰ مسیح کو بھانسنے ایک علاج اور مقبول برگزیدہ نمبر کے، خدائی کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔

ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِنْهُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ انْتَهُوا خَيْرًا ۚ لَّكُمْ إِلَهُ وَاحِدٌ ۚ سُبْحَنَهُ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا ۚ (آیت ۱۷۱)

اے اہل کتاب، دین میں غلو نہ کرو، اور اللہ کے بارے میں کوئی بات



حق کے سوا نہ کو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کے ایک پیغمبر بھی ہیں اور اس کا  
 کد جسے پہنچا دیا تھا اللہ نے مریم تک، اور ایک جان ہیں اس کی طرف سے  
 پس اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ (خدا) تم میں  
 (اس سے) باز آجائے، تمہارے حق میں ہی ہوتا ہے، اللہ تو پس ایک ہی جبار  
 ہے، وہ پاک ہے اس سے کہ اس کے بنا ہو۔ اُس کا ہے جو کچھ آسمانوں  
 میں اور زمین میں ہے اور اللہ ہی کا، کاد ساز ہونا کافی ہے۔

لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ  
 الْمُقَرَّبُونَ ۚ وَمَنْ يَسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ  
 فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَٰهُهُ جَمِيعًا (آیت ۱۷۲)

اور مسیح ہرگز اس سے عار نہ کریں گے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور نہ مقرب  
 فرشتے۔ اور جو کہ اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا، اللہ  
 سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔

اپنے دین میں غلو نہ کرو، یعنی افراط نہ تقریط۔ ٹھیک نہراط استقامت پر قائم رہو۔  
 مرشد تھانوی فرماتے تھے جس طرح یہود کا غلو، احکام ظاہری میں تعمق تھا، اور مسائل  
 باطنی کی طرف سے اعراض، اسی طرح عیسائیوں کے غلو میں، مسائل باطن میں تعمق اور  
 ظاہر کی طرف سے اعراض۔ طریق حق، ظاہر و باطن کو جمع کرنا ہے۔

اللہ کے بارے میں کوئی بات حق کے سوا نہ کہو، یعنی الوہیت کے باب میں کوئی  
 فیصلہ اپنا، اسے سے گڑھ نہ پیش کرو۔ اور توحید میں کوئی شاہد بھی شرک کا نہ آنے دو۔  
 اور مسیح ابن مریم کی حقیقت بھی پس اسی قدر ہے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول تھے،  
 جیسے اور بہت سے رسول گزر چکے ہیں، نہ کہ خدا، یا مظہر خدا، یا فرزند خدا۔ اللہ کے رسولوں  
 اور اس کے بھیجے ہوئے قاصدوں کو عبودیت یا نیم عبودیت پر پہنچا دینے کا مرض شرک



قوموں میں کثرت سے رہا ہے۔ عیسائیوں نے بھی مصری شرک اور یونانی و رومی شرک  
 فلاسفہ سے متاثر ہو کر اپنے پیغمبرِ برحق کو، مظهرِ خدا اور فرزندِ خدا قرار دے دیا، رہا ان کا  
 کَلِمَةُ اللَّهِ ہونا، تو اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ان کی پیدائش اللہ کے ایک کلمہ ہی کا  
 نتیجہ ہے، اور خود کلمہ سے مراد کلمہ اکُن ہے، جو بہ واسطہ جبریل علیہ السلام حضرت مریم پر  
 القاء ہوا۔

رُوحِ قِنْدُ، یعنی اللہ کی طرف سے اللہ کی بنائی ہوئی ایک روح، جو بہ واسطہ  
 فرشتہ جبریل، اور بلا اسباب ظاہری و مادّی، حضرت مریم کے بطن میں مجسم ہو گئے۔ اور کلمہ اور  
 روح کا انتساب اللہ کی جانب محض اس تعلق کے ثمر و غفلت کے اظہار کے لئے ہے جیسے  
 خانہ کعبہ کو بیت اللہ کہتے ہیں، حالانکہ اللہ کے گھر سب ہی ہیں۔ قرآن ہی میں ایک ترکیب  
نَعْمَتٌ مِّنَ اللَّهِ کی آئی ہے۔ حالانکہ جو نعمت بھی ہے وہ اللہ کی طرف سے تو ہوتی  
 ہی ہے۔

رُوحِ قِنْدُ سے مراد یہ نہیں کہ اللہ کی روح صرف انھیں میں تھی، اور کسی فردِ بشر  
 میں نہیں ہوتی۔ اللہ کی روح تو ہر فردِ بشر میں ہوتی ہے۔ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوحِيْ  
 قرآن مجید میں مقامِ تخصیصِ امتیاز پر کسی کو سَجْدَہٗ کا سے تعبیر کیا گیا ہے، اور کسی کو عَبْدَنَا  
 سے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اللہ کے بندے سب ہی ہیں۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ، یعنی اللہ کے پیروں پر ایمان لاؤ۔ پیروں ہی کی  
 تعلیم کے مطابق۔ اور فَاٰمِنُوْا کی طرف میں یہ اشارہ ہے کہ ان صحیح حقائق کو سمجھ لینے  
 کے بعد اب واجب ہے کہ اپنے خود تراشیدہ عقائد اور خیالات کو چھوڑ کر ایمان اللہ کے  
 رسولوں کی صحیح ہدایات پر لاؤ۔

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَہٗ : تین نہ ٹھہراؤ، اللہ بس ایک ہی ہے۔ نہ تین اقنوم، نہ تین مستقل بالذات  
 ہستیاں۔ تین کسی معنی اور کسی حیثیت سے بھی نہیں۔ تثلیث کا گورکھ دھندا جس طرح عیسائیوں



کتابوں میں درج ہے ہماری آپ کی، شاید سب ہی کی فہم سے بالاتر، وہ انھیں کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔ اور اگر آپ سن چکے ہیں تو دوبارہ سننے کا لطف حاصل فرمائیے۔ سنئے:

”باپ، بیٹے، روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے۔ جلال برابر۔“

غفلت ازلی یکساں۔ جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا، اور ویسا ہی روح القدس

ہے۔ باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق، اور روح القدس غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود،

بیٹا غیر محدود، اور روح القدس غیر محدود۔ یوں ہی باپ ازلی، بیٹا ازلی اور

روح القدس ازلی۔“

تاہم تین ازلی نہیں، بلکہ ایک ازلی، اسی طرح تین غیر محدود نہیں، اور نہ تین غیر مخلوق

بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود۔

باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق اور روح القدس قادر مطلق۔ تو یہ بھی تین قادر مطلق نہیں

بلکہ ایک قادر مطلق۔

ویسا ہی باپ خدا، بیٹا خدا، روح القدس خدا۔ اس پر تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا

کہاں توحید کا سادہ عام فہم کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ اور کہاں تثلیث کا یہ گورکھ دھندا

خدا کا صحیح رشتہ بندہ کے ساتھ صرف الہیت کا ہے۔ مالک و مملوک کے درمیان مباینت

لازمی ہے۔

برخلاف اس کے ولد اور مولود کے درمیان مجانست یعنی ہم جنسی وہم نوعی شرط ہے

تو جب ہر مخلوق اللہ کی ملوک ہے تو کوئی بھی مخلوق اس کی اولاد نہیں ہو سکتی۔

اور عقیدہ ولدیت غلط ہی نہیں بلکہ عقلاً مہمل ہے۔ تنزیہ الوہیت کے لئے باعث

توہین اور شان الوہیت کے لئے بالکل منافی ہے۔

وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا، اس حقیقت کے اظہار سے شرکوں پر یہ سوال قائم

کر دیا کہ کیا خدا کو بندوں کی حاجت روائی اور اپنی کارسازی میں کسی کی اعانت کی محتاجی ہے؟



جو وہ کسی کو شریک کرے۔

پھر اگلی اُمت میں ملائکہ مقررین کا عطف مسیح پر بہت معنی خیز ہے۔ ایک طرف ملائکہ مقررین اور دوسری طرف حضرت مسیح۔ یہی دو تہ دنیا میں کثرت سے پہچے ہیں بشر کو نے فرشتوں کو دیوی کو یوتاؤں کے نام دے کر شریک الوہیت کر لیا اور مسیحوں نے مسیح کو خدائی کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔ اسی لئے خصوصیت کے ساتھ تصریح ان دونوں کی نفی الوہیت کی گئی۔ اور بتایا گیا کہ اللہ کی عبدیت کوئی چیز توہین والی نہیں۔ مسیح اور ملائکہ مقررین تو اس پر فخر کرنے ہیں، نہ یہ کہ اس سے شرایں، یا کسی قسم کا بھی ننگ محسوس کریں۔ مرشد تھانوی نے اس موقع پر فرمایا کہ مراتب شرف میں عبدیت مرتبہ اعلیٰ ہے اور بیان کو ختم اس قانون پر کیا ہے کہ اللہ کی بندگی میں کوئی عار محسوس ہی کیسے کر سکتا ہے، جب اللہ ایسا حاکم مطلق ہے، مگر کیا فرشتے اور کیا پیغمبر سب ہی کو اس کی خدمت میں حاضری دینا ہی ہے۔

### —: (۴۵) پینچہ :—

سورہ مائدہ کے چھٹے رکوع کے آخر میں تاکید ہے کہ تقویٰ الہی اختیار کرو، اور اس پر اعتماد و توکل اختیار کرو۔ اس کے معابعد بنی اسرائیل کا ذکر آتا ہے اور تاریخی استناد کے طور پر بیان ان کے قبیلوں کا ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ  
أَشْنٰی عَشَرَ نَقِیْبًا ۚ وَقَالَ اللَّهُ إِنِّي مَعَكُمْ ۖ (آیت ۱۶)

اور بیشک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا، اور ہم نے ان میں بارہ سردار مقرر کئے تھے، اور ان سے کہہ دیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

لیکن پہلے تقویٰ کی قرآنی اصطلاح کا مفہوم یہاں سمجھ لیا جائے۔ قرآن مجید میں بار بار اشارہ صراحتیں اس مضمون کی ملتی ہیں کہ دنیوی غلبہ و کامیابی میں بڑا دخل تقویٰ کو رہتا ہے۔



قناعت، بے طمع، بے نفسی، جذبات پر قابو، صداقت شکاری، عدل، خود داری، غیرت مندی، حفظ حدود، شرف سیرت و کردار کی ساری ہی خوبیاں، کیا انفرادی، کیا اجتماعی، اس ایک جامع لفظ تقویٰ کے اندر آجاتی ہیں۔

اس کے بعد شہادت ایک متحد قوم بنی اسرائیل کی پیش ہوتی ہے کہ جب تک انھیں اطاعت و فرمانبرداری کے احکام، ان کے پیروں کے واسطے پہنچائے گئے، ان سے احکام کا عہد لیا گیا، اس وقت تک ان کا غل بھی ان کے قول کا ساتھ دیتا گیا۔ اور جب انھوں نے عہد شکنی کرنا اپنا شیوہ بنالیا، تب تو ویر باد ہو گئے۔

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا، یہ اسرائیلی سردار و تعداد میں ان کے قبیلوں کی تعداد کے مطابق تھے۔ ہر قبیلہ کا ایک ایک سردار۔ اور توریت کا بیان اس کے بالکل مطابق ہے۔ کتاب گنتی (Numbers) کے پہلے باب میں ہے کہ مصر سے اسرائیلیوں کے نکلنے کے دوسرے برس خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”بنی اسرائیل کی ساری جماعت کا مطابق ان کے فرقوں کے اور ان کے آبائی خاندانوں کے اہم شماری کے ساتھ ہر ایک مرد سے سرگن کر حساب کر، اور ہر فرقہ پر ایک ایک آدمی، ہر ایک جو اپنے خاندانوں کا سردار ہے، تمہارے ساتھ ہو۔“ (آیت ۲-۴)

آگے ان سرداروں کے درج ہیں، اور وہ تعداد میں بارہ ہیں۔ اور پھر اسی توریت میں ایک دوسری جگہ کنعان و فلسطین پر فوج کشی سے ذرا قبل کے موقع پر ہے:

”خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج، تاکہ کنعان کی زمین کی جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں، جاسوسی کریں، ایک ایک مرد جو اس کے آبائی فرقہ میں سے، جو اس میں سردار ہے، بھیج دے۔ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے موافق دس دس افراد میں ان کو بھیجا۔ وہ سب لوگ بنی اسرائیل



کے سردار تھے۔

یہاں بھی سرداروں کی تعداد بارہ ہی درج ہے۔

وَقَالَ اللَّهُ إِنِّي مَعَكُمْ : اس شرط اطاعت پر، اس جزاء معیت الہی کا ترتیب اب کیا بتایا جائے، کہ ایک موحّد و خدا پرست قوم کے لئے کس درجہ بہت آفریں و شوق افزا ہو سکتا ہے! دل اس کے بعد کس قوی و مطمئن ہو جاتا ہے، اور شکست کا کوئی احتمال بھی اس کے بعد ان کے سامنے نہیں آ سکتا۔ آج کوئی وزیر یا گورنر، رعایا کے کسی فرد سے کہہ دے کہ گھبراؤ نہیں، ہم خود تمہارے ساتھ ہوں گے، تو اس کا دلی کتنا بڑھ جائے اور کتنا حوصلہ اسے حاصل ہو جائے۔ چہ جائیکہ یہاں خالق کائنات، مالک الملک، حاکم علی الاطلاق، اپنی معیت کا یقین دلارہا ہے! تسکین و اطمینان کی کوئی منزل اس کے بعد باقی رہ جاتی ہے؟

یہ ایک پہلو تھا، اب دوسرے پہلو سے دیکھیے کہ کیا معیت بندے کے اس

استحضار معیت الہی کے بعد ممکن ہے؟

کسی بزرگ و مقبول بندہ کی نگرانی تو ہوا ہے نفس کو روک دیتی اور نفس پر ایک بریک لگا دیتی ہے، چہ جائیکہ ہمہ ہیں، ہمہ داں، ہمہ توان، مالک و مومن کی معیت کا استحضار!

غرض ترغیب و تہذیب کے جس پہلو سے بھی دیکھیے، یہ معیت الہی کا مراقبہ بہترین و موثر ہی ہے۔

یہ ہمارے محققین نے صاف ہی کر دیا ہے کہ معیت کے مراد معیت جسمانی تو ہو ہی نہیں سکتی، جیسی مخلوق مخلوق کے درمیان ہوتی ہے، بلکہ یہ معیت، احاطہ علم و قدرت و تصرف کے لحاظ سے ہے۔

— (۴۶) —

اور اسی سورۃ المائدہ میں جزم کے ساتھ یہ سببیت اور اس کی ایک خاص شکل کی تکفیر، جزم و قطعیّت کے ساتھ ہے۔ سببیت کی اکثر صورتیں تو کھلے ہوئے کفر و شرک کی ہیں







اسی عقیدہ مریم پرستی کے لئے اگر جہانوں کی تلاش ہو تو اس خاکسار کی انگریزی تفسیر کے مطالعہ کی زحمت گوارا فرمائیے۔

اور آگے سنئے ! :

وَاللّٰهُ مَلِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ  
مَا يَشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (آیت ۲۰)

اور اللہ ہی کی حکمرانی ہے، آسمانوں اور زمین پر اور جو کچھ ان کے درمیان

ہے۔ وہ جو کچھ چاہے پیدا کر دیتا ہے۔ اور اللہ کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔

یعنی ساری موجودات پر اور ساری کائنات پر حکمرانی تو ایسے اسی کی ہے، بلا کسی کی شرکت

و اعانت کے۔ اور بے اختیاری، بے بسی، اور غر، محض میں جیسے کل دنیا ویسے ہی حضرت

مسیح اور ان کی والدہ بھی۔ اس اعتبار سے اس میں ان میں کوئی فرق ہی نہیں۔ پھر تمہیں کیا

ہو گیا ہے کہ انہیں خدائی کے مرتبہ پر پہنچا دیتے ہو !

آیت کا آخری ٹکڑا معنویت سے لبریز ہے۔ اللہ جو چاہے، اور جس طرح چاہے

پیدا کر دے۔ مسیحیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت مسیح کی پیدائش چونکہ بن باپ کے ہوئی

ہے، اس لئے انہیں عام بشر یا محض انسان کیسے تسلیم کیا جائے۔ وہ یقیناً فوق البشر

تھے اور الوہیت میں حصہ دار۔ جواب اسی کا ارشاد ہو رہا ہے کہ اللہ تو ہر چیز کی تخلیق پر

قادر ہے، چاہے کبھی جس طرح ہو۔ سُنّتِ عادی و عمومی کے مطابق کبھی اور اس کے

مخالف کبھی۔ اس کی قوتِ خلائی کسی صورت و طریق کے ساتھ مقید و محدود نہیں، اور

وہ تخلیق کی ہر نوع اور ہر صنف پر قادر، بلا واسطہ ہو یا بہ واسطہ، سب اسکی قدرت کے

آگے بڑھ۔ اور وہ سب پر یکساں قادر۔ تو اس بنیاد کو بھٹکا کیا پیش کرتے ہوئے

—————:—————

ایک بڑی معرکہ کی بحث یہ ہے کہ جس طرح ہمارے دین میں متعدد خاندان ایسے ہیں



جو اپنے کو دیوتا زادے سمجھتے ہیں اور کوئی چند منہسی کہلاتے ہیں، یعنی چاند زادے، اور کوئی صورج منہسی، یعنی سورج زادے۔ اسی طرح اہل کتاب انبیاءِ اَدوں کا فخر اپنی عالی منہسی حدِ دوسے تجاوز کر کے خدا زادے ہونے تک پہنچ رہا تھا۔ اب قرآن میں اسی مقدمہ کی روداد ملاحظہ ہو:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصْرَانِيَّةُ ابْنُؤُنَّا اللّٰهُ وَاَحْبَبْنَاكُمْ (آیت ۲۱)

یہود اور نصرانی کہتے ہیں کہ ہم خدا کی اولاد اور اس کے چہیتے ہیں۔

اور اپنے اس قولی سے نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ اس لئے ہم خدا انسانوں سے کہیں اشرافِ فضل بھی ہیں

سَخْنٌ صِیغۂ جمع مشکم سے مراد افراد ملت نہیں، بلکہ قوم یا ملت تھے یعنی من حیث القوم اور نصرانی بہ اعتبار ملت۔

موجودہ بائبل میں ان کے فخریے آج تک لکھے چلے آ رہے ہیں :

”خداوند نے یوں فرمایا کہ اسرائیل میرا بیٹا، بلکہ پلوٹھا ہے۔“ (کتاب خروج باب ۴، آیت ۲۲)

”تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو۔“ (کتاب استثناء، باب ۱، آیت ۱)

یہ حوالے توریت کے تھے، اور جیوش انسا ایکلو پیڈیا، جلد ۶، ص ۴۵ پر انھیں عقائد

کی تکرار کی موجود ہے۔ وہی انجیل تو اُس میں بھی اسی طرح کی عبارتیں آج تک لکھی چلی آ رہی ہیں۔

”جنہوں نے اسے قبول کیا تو اُس نے انھیں خدا کا فرزند ہونے کا شرف بخشا۔“ (یوحنا باب ۱، آیت ۱۲)

ابْنَاءُ (جمع ابن کی) سے مراد حقیقی صلبی بیٹے نہیں۔ اس کے لئے عربی میں دوسرا

لفظ ہے۔ وَلَد۔ ابن کا اطلاق مجازی مُنہ بولے لڑکوں پر پوری طرح ہوتا ہے،

اور عربی میں اس کا یہ مجازی استعمال کثرت سے اور بہت عام ہے، امام لغت راغب

احقرانی نے اس کی بہت سی مثالیں اپنے لغت میں جمع کر دی ہیں۔ ابن اسمیل، ابن اللیل

ابن اسلم، ابن الیوم وغیرہ۔ اور دوسرے اہل لغت نے لکھا ہے کہ اب اور ابن اور



یہ من لفظ ایسے ہیں کہ بڑی کثرت سے وہ کسی کی جانب منسوب ہو کر استعمال ہوتے ہیں، اور ایسے ناموں کی ایک پوری فہرست دے دی ہے جو عربی میں بعض اسماء معرفہ و مذکرہ کے لئے چلتے ہوئے ہیں۔ مثلاً ابن لظین، یعنی حضرت آدم، ابن ایل یعنی چور، ابن الاقبال یعنی باتونی شخص وغیرہ۔

ہمارے مفسرین نے (اشتران پر رحمت کرے) بلا اس کے کہ بائبل کے حامدوں کی کوئی خصوصی مطالعہ کیا ہو، محض اپنے اشراق ایمانی سے یہی معنی قرار دیے ہیں۔ تفسیر کبیر و دیگر وغیرہ میں انھیں نقل بھی کیا ہے کہ ہم خاصانِ خدا ہیں، خاصانِ خدا کی اولاد ہیں، اس لئے خود بھی خاصانِ خدا ہیں شامل ہیں، اور ہمارا اور عام خلقت کا مقابلہ یہ کیا جمل انکی تفریروں کی یہی تھا کہ ہم خاصانِ خدا اور مقربینِ حق میں ہیں۔ وہی ذہنیت جو آج مسلمانوں میں بھی کتنے پیر زادوں، بزرگ زادوں، مخدوم زادوں کی ہے۔ قرآن اس عقیدہ پر زندگاتا ہے:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ۖ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ  
خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ (آیت ۱۲۸)

آپ کہہ دیجئے کہ تو پھر خدا تمہیں گناہوں پر سزا کیوں دیتا ہے۔ نہیں، بلکہ تم (محض بشر ہو) اس کی مخلوقات میں سے۔ وہ جسے چاہے گناہیں گنا

اور جسے چاہے گنا عذاب دے گا۔

یعنی بلا کسی استثناء و امتیاز کے۔ اس کا قانون جزا و سزا تو عام ہے، اور وہی معاملے لئے بھی ہے

اور وہی حاکم برحق اور قادر مطلق یہ وعدہ کر چکا ہے کہ اہل ایمان کے لئے مغفرت ہے اور اہل کفر کے لئے دائمی عذاب۔ بد اعمالی پر سزا تو ایک مشاہدہ فی حقیقت ہے جس کے کسی کو مجال انکار نہ تھی۔ اور دنیوی سزاؤں کے تذکرہ سے تو عہدِ متیق کے صحیفے بھرے پڑے ہیں۔ انھیں کی طرف یہود اور نصراہیوں کو توجہ دلائی ہے کہ قانون مجازات و مکافات بھلا



کسی کی رودرغایت کرتا ہے۔ عذاب سے بچنے پر تمہارا اپنی بزرگ زادگی پر تکیہ رکھنا کیا  
معنی رکھتا ہے ؟

### —: پتھر (۲۸) :—

بنی اسرائیل کی تاریخ اور یہود کے اعمال و عقائد کا بیان قرآن مجید کے خصوصی  
موضوعوں میں سے ہے اور بار بار آیا ہے۔ سورۃ المائدہ میں ایک جگہ ذرا نئے انداز  
میں ہے :

وَاذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ لِقَوْمٍ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ  
عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيكُمْ اَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا وَاَثَمَكُمْ  
ثَمًا لَمْ يُوْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِيْنَ ۝ (آیت ۲۴)

اور وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! اللہ کا  
وہ احسان تم اپنے اوپر یاد کرو، جب اس نے تمہارے اندر نبی پیدا کیے  
اور تمہیں خود مختار بنایا، اور تمہیں وہ دیا جو کسی قوم کو بھی نہیں دیا گیا تھا۔

حضرت موسیٰ اپنی قوم کو اللہ کے دُہرے احسان یاد دلادے ہیں۔ ایک یہ کہ پیغمبر  
انہیں کی قوم کے درمیان اُٹھتے رہے۔ فِیْكُمْ یہاں مِنْكُمْ کے معنی میں ہے یعنی تمہاری  
قوم کے درمیان نعمت نبوت رکھ دی اور نبوت چونکہ ایک مرتبہ شخصی و انفرادی ہوتا ہے اس  
لئے قرآنی بلاغت نے یہاں قید ”تمہارے درمیان“ کی لگا دی۔ اور دوسری نعمت بادشاہت  
ملوکیت یا مِلْکِیَّت کی ہے۔ چونکہ یہ قومی و اجتماعی ہے، اس لئے بلا کسی قید یا تخصیص کے اسے  
بلا کسی مِنْكُمْ یا فِیْكُمْ کے، یہاں محض جَعَلَكُمْ کہہ دیا۔

اس نکتہ پر نظر، قرآن کے ہر طالب علم کی خواہ اس کے عقائد کچھ بھی ہوں، اور وہ  
مسلم ہو یا غیر مسلم، ضرور پڑنا چاہیے، اور عبارت کی اس دقیقہ ری کی پوری قدر کرنا چاہیے۔  
مُلُوكًا کا ترجمہ اس میں آپ کو خود مختار بنایا جا رہا ہے عربی میں مِلْک کا مفہوم



بڑا وسیع ہے، محض بادشاہ یا تاجدار تک محدود نہیں۔ ہر آزاد، خود مختار، صاحبِ حیثیت شخص پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ لغت و تفسیر دونوں میں اسے صامت کہ دیا گیا ہے۔ اور حدیث میں ایسے شخص پر مَلِک کا اطلاق آیا ہے، جو اپنا ذاتی مکان اور خادم رکھتا ہو، تفسیر ابن جریر طبری میں ہے:

عن زید بن اسلم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم  
من كان له بيت و خادم فهو مَلِکٌ —

اور تفسیر قرطبی میں اسکا کئے مثل و روایت نقل ہوئی ہے اور خود قرآن مجید کی سورۃ البقرہ کوغ ۳۰ میں مَلِک سر دار فوج کے معنی میں آیا ہے، اِنْعَثْ لَنَا مَلِکًا نَقَاتِلُ۔ بلکہ جیوش انسائیکلو پیڈیا، جلد ۷، صفحہ ۵ سے پتہ چلتا ہے کہ اہل فلسطین کے محاورہ میں تقریباً ہر سردار بادشاہ ہی کہلاتا تھا۔

حضرت موسیٰ کی یہ تقریر ہے اس زمانہ کی جب بنی اسرائیل مصر کی غلامی سے آزاد ہو کر جزیرہ نماے سینا میں آزادی سے نقل و حرکت کر رہے تھے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جو ایک ہی وقت میں دینی و مبر و پیر بھی تھے اور دنیوی لیڈر اور سردار بھی ان سے مطالبہ کر رہے تھے کہ اپنے وطن فلسطین چلو اور ظالم و غاصب قوم عاتقہ کو نکال کر وہاں حکومت کرو۔ تازہ تاریخی، اثریاتی، معلومات سیکھتہ چلتا ہے کہ مصر سے ہجرت کرنے والی اسرائیل کا زمانہ ۱۴۴۰ ق م کا ہے اور فلسطین پر بنی اسرائیل کی فوج کشی کا زمانہ ۱۴۴۰ ق م کا۔ اس حساب سے حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا زمانہ اسی درمیانی مدت کا ہے، بلکہ عجیب نہیں کہ آپ کی عمر کے بالکل آخر حصہ کا زمانہ ہو۔ تو ریت کے صحیفہ استنار کے باب اول سے بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ اگر صحیح ہے تو اسی صحیفہ استنار ہی میں تصریح بھی موجود ہے کہ آپ نے یہ تقریر دریائے یردن کے کنارے اپنے واقعہ خروج مصر کے چالیسویں سال کے گیارہویں مہینہ کی پہلی تاریخ کو ارشاد کی تھی۔



اندر یہ شبہ نہ گزرے کہ اسرائیل کو بادشاہت اس وقت تک کہاں ملی تھی فتح کنعان  
(فلسطین) ہی اس کے بعد ہوئی۔ اور داؤد و سلیمان کی بادشاہتوں کا زمانہ تو اس کے  
صدیوں بعد کا ہے۔ لفظ مَلَاک کی تصریح ابھی چند منٹ قبل آپ کے سامنے گزر چکی،  
اور بالفرض اگر کسی کو ملوک کے معنی بادشاہ لینے پر اصرار ہی ہو، وہ یہ سن لے کہ  
قرآن اپنے زور بیان میں جو واقعات مستقبل میں پیش آنے قطعی و یقینی ہوتے ہیں انھیں  
برابر صیغہ ماضی میں بیان کر جاتا ہے۔ بادشاہت بنی اسرائیل کی یقینی تھی۔ اور اس کے  
یقینی ہی ہونے کی بنا پر اسے بجائے مستقبل کے صیغہ ماضی سے ادا کر دیا گیا۔  
تقریر کی بیان کی ہوئی دو نعمتوں، نبوت و ملکیت کی تشریح ہو چکی تیسری نعمت  
ابھی باقی ہے۔

وَالشُّكْرُ مَا لَمْ يُوْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ : انھیں وہ چیز عطا کی ہے جو  
دنیا پر ان والوں میں سے کسی کو نہیں دی گئی تھی، یعنی دولت توحید مذہبی حیثیت سے۔  
انھیں خطبات میں دو ایک مقام پر یہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ دولت توحید من حیث النعم  
اسرائیلیوں کے ساتھ مخصوص رہی ہے۔ دوسری قومیں اور نسلیں شرک میں پڑی رہا کرتی ہیں۔  
اور قوم اسرائیل شروع ہی سے اس شرف و فضل سے مشرف رہی ہے۔ ہمارے مفسرین کو (اللہ  
ان پر رحمت فرمائے) ایک عجیب دشواری اس مضمون کی آیتوں میں ہمیشہ پیش آتی رہی کہ اگر  
رب کے اشرف و افضل نسل اسرائیل کو مان لیا جائے تو پھر امت محمدی کے لئے کون سا مقام  
باقی رہ جائے گا۔ اشکال اور دشواری کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہے۔ مقابلہ تو یہاں دنیا کی  
قوموں اور نسلوں کا ہو رہا ہے اور ان میں رب کے اشرف و افضل نسل اسرائیل ہی ہے۔  
یعنی بجائے مشرکانہ خرافات، وہم پرستوں کے عقیدہ توحید اور اس کے لوازم رسالت  
وحی، لاکھ، حشر و نشر وغیرہ کی حامل ہی ایک قوم رہی ہے۔ لیکن امت محمدی نام کسی نسل  
یا قوم کا کب ہے؟ اس کی بنیاد تو بجائے نسل و نسب کے صرف عقائد صحیحہ پر ہے اور



اسرائیلی ہو کر اسماعیلی، عرب ہو کر عجم، حبشی ہو کر حبشی، گورڈا ہو کر کالا ہو، مغربی ہو کر مشرقی، جو کوئی بھی توحید و رسالت کا کلمہ پڑھنے لگے، بس وہی اُمت محمدی میں داخل و شامل ہے خاتم النبیین کی نبوت جس طرح سلسلہ انبیاء کی خاتم ہوئی ہے، قومی و نسلی برتری کی بھی قوت قاطعہ ہے۔

————— پیڑ ۱۴۹ —————

قرآن فہمی میں ایک بڑا مانع، ہم اُردو دانوں کے لئے، یہ آپڑا ہے کہ جو الفاظ عربی اور اُردو میں مشترک ہیں، انھیں قرآن میں بھی، اُن کے اُردو ہی مفہوم میں سمجھ لیا گیا ہے کہیں کہیں تو بیشک اشتراک لفظی کے ساتھ معنوی بھی ہے لیکن کثرت سے یہ سمجھ کر لفظ اصلاً آیا تو اُردو میں عربی ہی سے، لیکن اپنا مفہوم پورے کا پورا اپنے ساتھ نہ لایا کہیں کچھ تھوڑا سا مفہوم لے کر آیا، اور باقی وہیں چھوڑ آیا، اور کہیں ایسا ہوا کہ یہاں آکر پھیل گیا، اور وہ مطالب اپنے اندر پیدا کر لئے جو عربی دان کے خیال میں بھی نہ آئے۔ اور کہیں تنگی اور وسعت دونوں سے الگ ایک نیا ہی مفہوم پیدا ہو گیا۔ لفظ ”وسیلہ“ اور لفظ ”جہاد“ بھی ایسے ہی ہیں، جن کا اُردو مفہوم ان کے عربی مفہوم سے بالکل جدا گانہ ہے اور اس کی مثال سورۃ المائدہ ہی کی اس آیت میں مل جاتی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ  
وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (آیت ۴۰)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور اس کا قرب حاصل کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو، تاکہ تم ہر طرح فلاح پاؤ۔

عربی میں وسیلہ کے معنی قرب یا نزدیکی کے ہیں۔ ابن جریر طبری، قرطبی، ابن قیمہ

سب نے یہی معنی لئے ہیں۔ یہی معنی متعدد تابعین، مجاہد، حسن، قتادہ، وطاء وغیرہ سے منسلک ہوئے ہیں، اور قرب۔ حق کا سترین وسیلہ احکام الہی کی تعمیل ہے۔ ابن عباس صحابی نے کہا ہے:-



اطلبوا اليه القرب في الدرجات عند الله -

اور تفسیر کبیر میں ہے :

فالمراد طلب الوسيلة اليه في تحصيل مرضاته وذلك  
بالعبادات والطاعات -

اور وسیلہ سے مراد مرضیات الہی کی طلب و تحویل ہے۔ عبادتوں اور طاعتوں  
کے ذریعے سے۔

ہمارے اہل جن لوگوں نے وسیلہ کے تحت میں بزرگوں سے استعانت اور  
اولیاء اور ذریعہ سے استغاثہ جائز رکھا ہے، انھوں نے قربانی کے وسیلہ یعنی قرب کو، اور اس کے  
وسیلہ یعنی ذریعہ کا مراد نہ سمجھ لیا ہے۔ اور ایسی شدید رفا حش غلطیوں کی مثالیں شاذ نہیں  
کثیر الوقوع ہیں۔ علامہ آلوسی بغدادی، صاحب روح المعانی نے تفصیل سے اس موضوع پر  
کلام کیا ہے اور لکھا ہے کہ :

”یست یا غائب شخص سے دُعا کرانے کے ناجائز ہونے میں کسی بھی عالم کو شک  
نہیں، اور یہ ایسی بدعت ہے جس کا ارتکاب سلف میں سے کسی نے بھی نہیں کیا  
ہے۔ حضرات صحابہ سے بڑھ کر نیکی اور ثواب کا حریص اور کون ہو سکتے۔ لیکن کسی ایک  
صحابی سے بھی منقول نہیں کہ اس نے صاحب قبر سے کچھ طلب کیا ہو۔“

آخر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ :-

”حضرت عبداللہ ابن عمر کا، اتباع سنت تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے  
لیکن ان کی حالت یہ تھی کہ جب روضہ نبوی پر حاضری دیتے تو صرف اس قدر کہتے  
کہ السلام علیکم یا رسول اللہ، السلام علیک یا ابا بکر، السلام علیک  
اور اس سے زائد کچھ نہ کہتے، نہ کچھ مانگتے۔ نہ سرورِ عالم سے اور نہ ان کے  
کرم مقربین سے۔“



اور وسیلہ کی طرح عربی لفظ جہاد کو بھی لوگوں نے اردو کے جہاد کے معنی میں لے رکھا ہے۔ اردو میں جہاد ایک دینی اصطلاح کی حیثیت سے قتال فی سبیل اللہ کے معنی رکھتا ہے، اور اسی کے لئے مخصوص و محدود ہو چکا ہے۔ عربی میں یہ صرف و قید کچھ بھی نہیں۔ عربی میں جہاد کا مفہوم بہت وسیع و عام ہے۔ ہر سخت کوشش جو کسی بھی دینی غرض سے کی جائے۔ خصوصاً دشمنانِ دین کے مقابلہ میں جہاد ہی کا درجہ رکھتی ہے۔ اور جہاد جس طرح میدانِ رزم میں تیرو تفتیک سے ہو سکتا ہے، اسی طرح بزم میں مال و دولت سے اور زبان و قلم سے بھی ہو سکتا ہے۔

اور انھیں دُعا اعمال، ایک طلبِ قرب، اور دوسرے جہاد پر ترتیبِ فلاح کا ہو جانا ہے۔ اور اخیر میں خوش خبری ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ، تاکہ تم فلاحِ باب ہو جاؤ۔ اور فلاح کے تحت میں دنیا و آخرت کی ہر کامیابی اور ہر کامیابی آگئی۔

### — (۵۰) —

تبلیغ کی دین میں جو اہمیت ہے، وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ قرآن میں بار بار اس کی تاکید کی ہے۔ ایک مقام اسی طرح کا، اسی سورۃ المائدہ میں ہے۔ اور بہت معنی خیز ہے:

يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝ (آیت ۲)

اے ہمارے پیغمبر! پہنچا دیجئے جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اُتر رہا ہے، اور اگر یہ آپ نے نہ کیا تو آپ نے اللہ کا پیام پہنچایا ہی نہیں۔ اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔ یقیناً اللہ کا فرود گواہ دے گا۔

پہلے اندازِ خطاب دیکھیے، آیۃ الرُّسُولِ تبلیغ کے موقع پر اور اس کے سیاق میں۔ خطاب



خود ہی کتب تبلیغ و حکیمانہ ہے۔ گو اسے مخاطبِ تمنا ہی تو حیثیت ہی تھا مگر رسول کی ہے پیام  
پہنچانے والے کی ہے۔ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ ذِكْرٍ مِّن قُرْآنٍ مُّجِيدٍ كَاسَا  
ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ باقی جو چیزیں وحیِ خفی کے راستہ سے رسولِ اشرف کو تعلیم ہوئی تھیں وہ  
بھی اس عموم کے اندر شامل ہیں۔ ابن عباس صحابی سے یہی معنی منقول ہیں، اور فقہائے  
مفسرین میں سے قرطبی، عیاض اور نسفی اسی طرف گئے ہیں۔ اہل بیت کے معنی یہ ہوئے کہ  
آپ نے کوئی بات بھی اگر چھپائی تو رسالت کا حق ہی نہیں ادا کیا۔ اس میں روایگان  
اہل باطل کا جن کا یہ عقیدہ ہے کہ نوحی بائبل، رسول نے اُمت کو قرآن پورے کا پورا  
نہیں پہنچایا، بلکہ کسی خوف یا کسی مصلحت سے اُسے کسی قدر ناقص صورت میں پہنچا ہے۔  
درحقیقت یہ ہے بھی مرتبہ رسالت سے بہت ہی گری ہوئی بات کہ پیغمبر جیسا عبد کامل  
کوئی حکم شریعت کسی کی مروت یا کسی کے دباؤ سے چھپا جائے اور عائشہ صدیقہؓ نے کسی  
لطیف اور سچی بات اس موقع پر کہی ہے کہ اگر آپ نے کوئی بھی جزو قرآن کا چھپایا ہوتا  
تو وہ ہی ہوتا۔ اور اگر یہ کہے کہ قرآن نے اس درجہ مستبعد مفروضہ کو آپ کی جانب منسوب ہی  
کیسے کیا، تو قرآن نے تو محالات عادی بلکہ محالات عقلی تک کا ذکر و بیان قرآن ہی میں کر دیا۔  
مثلاً تاکیدِ توحید کے سلسلہ میں ایک کے بجائے دو خداؤں کا فرض کرنا، اور اس حکم کو اور  
مؤکد بنانے کے لئے تہقّق کے لہجہ میں ارشاد ہوتا ہے: وَاللّٰهُ يُعَذِّبُكَ مِنَ النَّاسِ۔  
اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا، آپ تشویش و فکر نہ کریں، یہ آپ کو ہرگز ہلاک  
کرنے پر قدرت نہ پاسکیں گے۔ اور یہاں یہ سوال نہ کیجئے کہ جب محفوظیت کا وعدہ ہو چکا  
تھا تو پھر جنگِ احد میں جسم مبارک کو جراثیم کیسے پہنچیں۔ مفسروں نے یہ سوال پیدا کر کے جواب  
اپنے اپنے رنگ کا دیا ہے۔ لیکن سب کے صاف اور بے تکلف جواب مفسرِ تھانویؒ کے قلم سے  
نکلا ہوا یہ ہے کہ وعدہ محفوظیت تو سیاقِ تبلیغ میں کیا گیا ہے، اس لئے اس کا تعلق بھی  
قدرۃ بس اتنی ہی محفوظیت سے ہے، جو آپ کے فرائضِ تبلیغ میں مانع نہ ہو۔ بالکل محفوظیت



مقصود تھی، نہ ہو سکتی تھی۔ مرض اشم، صدر و غم وغیرہ تو حکمت تکوینی کے ماتحت رفع درجہ  
اور بلندی مراتب کے لئے ضروری ہیں۔ یقیناً اللہ اس کا موقع نہ دے گا کہ آپ کے دشمن آپ  
تک پہنچ کر تبلیغ دین میں کوئی رُکاوٹ پیدا کر سکیں۔ اور فقہانے آیت سے استنباط کیا ہے  
کہ رسول ہی کی طرح نابیان رسول، یا حکماء امت کے لئے جائز نہیں کہ کسی مسئلہ شریعت میں  
اختلاف و کتمان سے کام لیں۔

### بین (۵) پینہ

آج کی صحبت میں، اور کچھ ہی دیر پہلے، آپ سن چکے ہیں کہ جن لوگوں کا عقیدہ ہے  
کہ مسیح ہی تو خدا ہیں، قرآن اُن کی تکفیر قطعی ظاہر کر چکا، اور انھیں دائرہ شفاعت و سفارش  
سے باہر رکھ چکا ہے۔ اب ایک دوسرے عقیدہ کو بھی سن چیلئے، جو پہلے عقیدہ کی طرح ایک  
محدود فرقہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ دنیا کے مسیحیت میں خوب رچا بسا ہوا، اور قرآنی نصرت  
سے الگ، اور کہیں پست و فروتر ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۖ (آیت ۷۷)

یقیناً وہ (لوگ بھی) کافر ہو گئے، جنہوں نے کہا خدا تین میں سے ایک ہے۔

یہ کھلا ہوا اشارہ عقیدہ تثلیث کی جانسی ہے، یعنی اس عقیدہ کی طرف کہ باپ، بیٹا و روح القدس  
یہ تینوں اقنوم (آئل) خدا ہیں، منفرد ابھی اور مجموعاً بھی، الگ الگ خدا ہیں، اور تینوں علی کر  
بھلی خدا۔

اور اس وقت دنیا کے مسیحیت کا عام عقیدہ یہی ہے۔ قرآن نے اس عقیدہ پر صاف  
کفر کا اطلاق کیا ہے، اور اس کے ماننے والوں کو کافر کے لقب سے یاد کیا ہے، اور نصاریٰ  
والہل کتاب سے انھیں الگ کر دیا۔ یہ پس پڑے کھرے کافر ہیں، ایمان کے دائرہ سے خارج،  
اور مٹا حقیقت حال بھی بیان کر دی۔



وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا إِلَهُ وَاحِدٌ ؕ قَوْلٌ لِّمَنْ يَنْتَهَوِ عَمَّا يَقُولُونَ  
لِيَمَسَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (آیت ۷۷)  
اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی معبود نہیں، بجز خدا سے واحد کے اور یہ لوگ  
اگر اپنے ان اقوال سے باز آئے تو ان میں جو لوگ کافر ہیں گے ان پر عذاب  
دردناک واقع ہو کر رہے گا۔

کوئی خدا بجز ایک کے نہیں، نہ عدد و شمار کے لحاظ سے، نہ کسی اور اعتبار سے۔ مِنْ إِلَهٍ  
مِنْ زَائِد، کلیت یا استغراق کے لئے ہے۔

عذاب واقع ہو کر رہے گا، آخرت میں تو بالیقین، اور دنیا میں بھی حسب مصلحت کو نبی  
و عیدان کے حق میں ہے جن پر اس عقیدہ کی گمراہی پوری طرح واضح ہو کر رہی اور پھر بھی  
اسی پر قائم ہے مِنْهُمْ مِنْ تَبَعِیَّةٍ ہے۔ اس نے یہ صاف کر دیا کہ علم الہی میں یہ  
بات تھی کہ دنیا میں بہت سے لوگ اپنے اس کافرانہ عقیدہ سے باز آجائیں گے اور ایمان  
صحیح لے آئیں گے۔ وہ لوگ اس وعید سے خارج ہیں۔ حقیقت مثبت کا بیان ایک ہی  
آیت بعد پھر ہے :

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ ؕ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ  
فَأَمَّا صِدْقُهُ ۖ كَانَا يَأْكُلَنِ الطَّعَامَ ؕ أَنْظِرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ  
لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ أَنْظِرْ أَنِّي يُؤْفَكُونَ ۝ (آیت ۷۸)

یسیح ابن مریم کچھ بھی نہیں، بجز ایک رسول کے، جن سے قبل اور بھی رسول  
گزر چکے ہیں۔ اور ان کی ماں و والدہ نہیں۔ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھئے کہ  
ہم کس طرح صاف دلائل اُن کے سامنے بیان کر رہے ہیں۔ پھر دیکھئے وہ کس طرح  
اُٹنے چلے جاتے ہیں۔

یعنی محض رسول خدا۔ ایک طرف نہ خدا، نہ فرزند خدا، نہ منظر خدا، نہ مثل خدا اور دوسری



طرف نہ ساحر، نہ شعبدہ باز۔ صحیح مرتبہ میں ایک رسول کا، جیسے کہ پہلے بھی رسول آچکے ہیں۔  
 ابن موریس، لا کر یہ یاد دلایا کہ ایک عورت کے بطن سے تھے، اور اس لئے بجز بشر کے  
 اور کیا ہو سکتے تھے۔ اور ماں صدیقہ تھیں، یعنی ولیہ تھیں، نہ مادر خدا، اور نہ معاذ اللہ کوئی مشتبہ چال چلن،  
 دانی۔ اور دونوں کَنَا یا کَلَن الطَّحَام۔ اپنے سارے تقویٰ کے باوجود اس  
 مادی اور بشری جسم کے ساتھ، ساری مادی و جسمانی ضرورتوں کے محتاج۔ اتنی صاف، سیدھی  
 صریح حقیقت سن کر بھی ان ثلث پرستوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح کے خرافات میں پڑے  
 ہوئے ہیں۔

”اقانیم میں تینوں خدا کی وحدت ایک ہے۔ تین خدا نہیں۔“

ترکیب کے وحدت پیدا ہوتی ہے اور وحدت کا نام ہی ترکیب ہے۔“

”اقنوم وجود باپ ہے، اقنوم جان بیٹا، اور اقنوم علم روح القدس“

یہ صرف نمونے کے طور پر چند سچی اسرار و نبیات نقل کر دیے گئے۔

اب آج کی صحبت کے اختتام پر وہ آیت ملاحظہ کیجئے جس میں سچی شرک کی جرّ بنیادی

پوری نشان دہی کر دی ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْا

اَهْوَاۗءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّضَلُّوْا

عَنْ سَوَاۤءِ السَّبِیْلِ ۝ (آیت ۸۲)

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو، اور ان لوگوں کے

خیالات پرست چلو جو پہلے (خود بھی) گمراہ ہو چکے ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر چکے

ہیں اور راہِ راست سے بھٹک چکے ہیں۔

اس میں صاف اشارہ اس کا آگیا کہ مسیحیت کی گمراہیاں و بد عقیدگیاں کسی دوسری گمراہ و کجرو  
 اور زمانہ سچ سے قبل کی قوم کی ریس اور تقلید نے پیدا کی ہیں۔ اور اہلواء کہتے ہیں انھوں نے نبی



خیالات میں گڑھت عقائد اور خیالی ڈھکوسلوں کو۔ جو لوگ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ سے نفرت  
ہیں، اور خود عالم و فاضل فرنگیوں کی مرتب کی ہوئی (Biblical Criticism)  
پر نظر رکھتے ہیں، وہ ان باتوں کی باتوں پر عیش عیش کر اٹھیں گے۔

چھٹی صدی عیسوی کا ایک عرب امی یا خزان تاریخی حقائق سے باخبر ہو ہی کیسے  
سکتا تھا! ماد قیقہ عالم الغیب اسے براہ راست تسلیم نہیں دے رہا تھا۔

قدیم مصری شرک جو یونانیوں میں پوری طرح حلول کر آیا تھا، اور بڑے بڑے یونانی  
فلسفی، اسکندریہ کے مرکز عقلیت۔ روشن خیالی سے مرعوب و متاثر تھے، حضرت عیسیٰ کی تعلیم  
جب شروع شروع پھیلی تو اس پر یہود کے اکابر

انہیں یونانیوں کے آگے گردن ڈال چکے اور ان سے علول (LOGOS) وغیرہ  
کے عقیدے اخذ کر چکے تھے۔

مسیحیوں نے ان مشرکانہ خرافات کو بلا تامل قبول کر لیا، اور پھر پولس (سنت پال)  
نے حضرت مسیح کے تعلیمات کو تمام تر مسیح کر کے مسیحیت کو یونانی شرک کی ایک شاخ ہی  
منادیا۔

آخر میں یہی سہی کسر رومیوں کے مشرکانہ عقائد و خرافات نے پوری کر دی۔  
موجودہ مسیحی قوموں کے عقائد و رسوم کثرت سے مصری شرک، یونانی شرک اور رومی شرک  
کی صدا سے باز گشت ہیں، اور بس!





# پانچواں خطبہ

— (۵۲) —

مسیحیت، تثلیث اور مسیح پرستی کا رد سورہ آل عمران میں اچھا خاصہ ہو چکا ہے لیکن سورہ المائدہ میں بھی کچھ کم نہیں۔

دو چار آیتیں اس موضوع سے متعلق پچھلے خطبہ میں گزر چکیں۔ اب سورہ کے ختم کے قریب اسی موضوع کی مناسبت سے پہلے کچھ فقرے تذکیر و موعظت کے آئے ہیں وہ بھی ملاحظہ ہوں۔ ابتدا میں ایک عام تذکرہ حشر میں پیبروں سے سوال و جواب کا ہے، جو ایک موثر موقع کشی کا کام دیتا ہے:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ قَالَوَا لَا عِلْمَ  
لَنَا بِاتِّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝ (آیت ۱۰۹)

(اس دن سے ڈرو) جس دن اللہ پیبروں کو اکٹھا کرے گا، پھر ان سے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب ملا تھا، وہ عرض کریں گے کہ ہم کو کچھ علم نہیں چھپی ہوئی باتوں کو خوب جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔

انبیاء کے جواب کا ماحصل یہ ہے کہ ہمیں علم نہیں کہ ہمارے پیچھے ان لوگوں نے کیا کیا کہا! یا یہ کہ ان کے واقعی عقیدے کیا تھے۔ ہم تو ان کے صرف ظاہری اعمال و اقوال کو جانتے ہیں۔ باطن کا



علم تو بھی کو ہو سکتا ہے۔ اور جزا تو صرف اصل عقائد ہی پر ملے گی۔ اور یہی جواب غلبہ خشیت سے ادباً و احتراماً بھی ادا ہو گا۔ گویا وہ کہیں گے کہ تیرے علم کامل و محیط کے آگے ہمارا علم پیچ ہے۔ جو کچھ ہمیں علم ہے کبھی اُس کا تم سے عالم تر تو تو ہی ہے، اور اس پر مستزاد یہ کہ ہمیں جو کچھ علم حاصل ہے وہ محض درجہ نطن کی چیز ہے۔ اور آج دن کشف حقائق کا ہے، جب محض نطن کام نہیں لے سکتا۔ آج علم ہی کام دے گا، اور وہ بھی کو حاصل ہے۔

اس عمومی تمہید کے بعد ذکر خصوصی حضرت عیسیٰ کا شروع ہوتا ہے۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ادْكُرْ دِجْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَى  
وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدْنَاكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ فَتُكَلِّمُ النَّاسَ فِي  
الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَإِذْ عَلَّمْنَاكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ  
وَالْإِنْجِيلَ ۚ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ  
فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَتَنْزِيْلُ الْأَكْمَةِ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي  
وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَى بِإِذْنِي ۚ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَءِيلَ عَنْكَ  
إِذْ جَعَلْتَهُمْ بَالِغِينَ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنَّ هَذَا  
إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝ (آیت ۱۱۰)

(اور وہ وقت یاد میں رکھو) جب اللہ عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا کہ میرا انعام اپنے  
اور اپنی والدہ کے اوپر یاد کرو، جب کہ میں نے تمہاری تائید روح القدس کے واسطے  
سے کی تھی۔ تم آدمیوں سے کلام گو میں بھی کرتے تھے اور بڑی عمر میں بھی۔ اور جب  
کہ میں نے تمہیں عیسیٰ السلام کی کتاب و حکمت کی اور تورات و انجیل کی، اور جب تم پر بند جیسی  
ایک شکل وجود میں لائے تھے میرے حکم سے، اور پھر تم اس کے اندر پھونک مارے تھے  
تو وہ پرندہ بن جانا تمہاں میرے حکم سے، اور تم باور زاد اندھے اور کمزور بھی کہ تمہاں  
کو دیتے تھے میرے حکم سے، اور جب تم مردوں کو نکال کھڑا کرتے تھے میرے حکم سے،



اور جب کہ میں نے روک رکھی تھی۔ بنی اسرائیل کو تم سے جب تم ان گئے۔ اس دشمن  
نشانیاں لے کر آئے تھے۔ پھر ان میں سے جو کفر اختیار کے رہے وہ بوسے کر۔ تو کچھ  
نہیں، بس ایک گھلا ہوا جادو ہے۔

أَذْكُرُ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ نے صاف کر دیا ہے کہ انعامات کا سرچشمہ  
تو وہی ایک ذات تبارک و تعالیٰ ہے۔ سچ اس کے صفت ایک نعمت یافتہ و مقرب بند  
اور والدہ سچ اس کی صفت ایک نعمت یافتہ اور عزیز بند ہی ہیں۔

لفظ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ میں یاد دلایا ہے کہ وہ ایک عورت کے بطن سے پیدا ہوئے  
نہ کہ ابن البشر۔

عَلَىٰ وَالِدَتِكَ کے طریق مخاطب سے مرشد تھانویؒ نے استنباط یہ کیا ہے کہ اہل بشر  
کی اولاد میں ہونا بھی ایک نعمت و شرف ہے۔ رہی آپ کی تعلیم کتاب و حکمت تو سارے ہی  
پیغمبر اس کاٹھ سے شاگرد حق تعالیٰ ہوتے ہیں اور سب کے بڑھ کر ہمارے حضرت خاتم النبیین۔  
اور المکتب سے سیاق میں مراد جنس کتاب ہے۔

اب رہے وہ خوارق و عجائب جو آیت کے اس ٹکڑے میں گنائے گئے ہیں ان  
سب کی تشریح ایک پچھلے خطبہ میں سورہ آل عمران کی آیتوں کے حوالہ سے اور ان کے ذیل  
میں عرض کی جا چکی ہے

يَا ذِي النُّفُورِ کی تکرار بڑی ہی اہم اور قابل غور ہے۔ خوارق و عجائب جو کچھ بھی ہوئے  
بادی النظر میں وہ کیسے ہی عجیب و غریب ہوں۔ بہر حال تھا وہ سب کچھ کسی نہ کسی قانون الہی  
ہی کے ماتحت، قانون تکوینی ہی کی کسی نہ کسی دفعہ کے ماتحت۔ ہر اچھوتہ میں خالق کائنات  
ہی کا کوئی نہ کوئی قانون کار فرما تھا۔ معجزہ کی حقیقت جیسا کہ پہلے ہی عرض ہو چکا ہے، بس  
ایسی ہی ہے کہ وہ خارق عادت ہو جس کا ظہور ہمیر کے ہاتھ پر منکروں اور کافروں پر ہمیر کی  
سائیدہ شبی اور نصرت الہی کے اظہار کے لئے کرایا جائے۔ اور خارق عادت وہ واقعہ یا فعل ہے



جو کائنات مادی میں بندوں کے سمجھے اور قرار دیئے ہوئے کسی آئین و قاعدہ سے الگ ہو۔  
 مگر فطرت کا عام قانون و قاعدہ تو بندوں ہی کے مشاہدات و تجربات سے اخذ کیا جوتا ہے  
 مثلاً ہمارے ملک میں جون کے مہینہ میں تیز گرمی اور دسمبر کے مہینہ میں تیز سردی عموماً عادتاً  
 ہوتی ہے۔ اب کسی پیمبر کی دعا سے جون میں برف پڑنے لگے اور دسمبر میں ٹوہلنے لگے  
 تو یہ اس پیمبر کا معجزہ ہوا۔ مادیات یا پتھر پرستوں کی پہلی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے بندوں  
 کے تجربہ و مشاہدہ کو خود خالق کی طرف سے کسی مستقل قانون یا قاعدہ کا اعلان سمجھ لیا۔ اور  
 دوسری غلطی یہ کہ وہ قاعدہ و مشاؤون کو قانون قرار دیا اور قاعدہ گر کی مرضی و ارادہ سے بے نیاز  
 مستقل دستور لا یزال حقیقتیں قرار دے بیٹھے۔

تَخْلُقُ یہاں جس سیاق میں آیا ہے اس کے لحاظ سے تَخْلُقُ کے معنی صورت  
 بنانے کے ہیں۔ نبت سے ہست کرنے کے نہیں۔ اور صاحب کثافات نے اسے بھی  
 صاف کر دیا کہ فَتَنَفْ فِيهَا میں ضمیر هَيْئَةً کی طرف نہیں کوہِئَةً کے  
 کائنات کی جانب ہے۔

اخیر آیت میں یہ جو آیا ہے کہ منکر اور باغی اسرائیلیوں کا حضرت مسیح پر دست از  
 ہمک پس نہ چل سکا، تو یہ اشارہ اس تاریخی حقیقت کی طرف ہے کہ یہود نے آپ پر غلبہ حاصل  
 کرنے کی بار بار کوشش کی اور بار بار ناکام رہے۔ چنانچہ انجیل یوحنا میں ہے کہ:  
 ”انہوں نے یسوع کو مارنے کا بیڑا اٹھایا تھا، مگر یسوع چھپ کر بیکل سے

نکل گیا۔“ (باب ۸، آیت ۵۹)

اور دوسری جگہ اسی انجیل میں ہے:

”انہوں نے اس کو پکڑنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔“

(باب ۱۰، آیت ۳۹)

الْبَيِّنَات کے تحت میں دلائل عقلی اور خوارق و معجزات سب آگئے۔



## —: (۵۳) :—

اسی سورۃ المائدہ کے بالکل ختم پر ایک اور بڑا موثر مکالمہ حشر کے دن کا مذکور ہے اور اس میں رزمیہ صحت اور مسیح پرستی کا ایک نئے عنوان و اسلوب سے ہے۔

وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ  
اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَهَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ (آیت ۱۱۶)

(ذہن میں لے آؤ وہ وقت) جب اللہ سوال کرے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم یہ تو بتاؤ کہ کیا تم لوگوں سے یہ کہہ آئے تھے کہ اللہ کے علاوہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنالینا۔

آیت میں تو لفظ قَالَ ہے اور ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ یہ صیغہ ماضی کا ہے لیکن یہ بھی قرآنیات کا ہر ادنیٰ طالب علم جانتا ہے کہ قرآن میں ذکر جب کسی مستقبل واقعے سے متعلق آتا ہے تو اظہار اس سے قطعیت کا کرنا منظور ہوتا ہے یعنی جس چیز کا آئندہ ہونا قطعی اور یقینی ہوتا ہے، اس کو قرآن یوں بیان کرتا ہے جیسے وہ واقع ہو چکی۔ تو قرآن یہاں بھی اپنے اسی عام اسلوب بیان کے مطابق کہتا ہے کہ ذرا اس منظر کو اپنے سامنے لے آؤ کہ جب حق تعالیٰ سوال کرے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم یہ تعلیم دے آئے تھے کہ خود تم کو اور تمہاری والدہ کو بھی اللہ کے علاوہ معبود ٹھہرایا جائے ؟

مسیح پرستی تو خیر موجودہ رائج الوقت مسیحیت کے مرادف ہے ہی، مریم پرستی بھی دنیا کے مسیحیت کا کوئی مخفی اور نامعلوم واقعہ نہیں (Divine Virgin) ”خدائی باکرہ“ ان کا گھلا ہوا لقب ہے، ندریں اور تئیں ان کی مانی جاتی ہیں، نیازیں ان کے نام پر ہوتی ہیں دعائیں انہیں مخاطب کر کے کی جاتی ہیں، کیتھولک گرجوں میں قد آدم تصویر ان کی لگی رہتی ہے، اور اس کے آگے رسوم پرستش بجالائے جاتے ہیں۔ کتابی حوالوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں اس خاکسار کی



## انگریزی تفسیر۔

آخرت میں جو سوال حضرت مسیح سے ہوگا، ظاہر ہے کہ اس سے محض استفہام مراد نہیں، بلکہ مریم پرستوں پر مزید جھٹ قائم کرنا، اور انہیں شرمندہ و خجل کرنا اور انہیں آپ اپنی نظر میں ذلیل کرنا ہے۔ تنخاطب میں لفظ مسیح نہیں بلکہ محض اہلی نام عیسیٰ ہے ابن مریم کے اضافہ کے ساتھ، اور اس صفت کے یاد دلانے کو کہ وہ انسان ہی نہیں انسان زاد سے بھی ہیں!

یہ تو ہوا سوال۔ اب وہ جواب کے پہلے ہی فقرے میں عرض کرتے ہیں:

قَالَ سُبْحَنَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ

عرض کریں گے کہ پاک ہے تیری ذات۔ یہ تو مجھ سے ممکن نہ تھا کہ میں ایسی

بات کہہ دیتا جس کا مجھے کوئی حق ہی نہ تھا۔

یعنی بارگاہ تیری ذات برتر و بالا ہے۔ ہر شرک کی آلودگی سے اور ہر ایسے اغساب کے جو تیرے شان و شان نہ ہو۔ بھلا میری مجال تھی کہ میں ایسا صریح کلمہ باطل زبان سے نکال سکتا۔ اور آگے عرض کریں گے:

إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا

أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ (آیت ۱۱۶)

اور اگر میں نے (کہیں) کہا ہوتا تو ضرور ہی تجھے اس کا علم ہوتا۔ تو جانتا ہے

جو کچھ میرے دل میں ہے، اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے دل میں ہے بیشک

تو تو پوشیدہ چیزوں تک کا خوب جاننے والا ہے۔

بالفرض میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوتی تو ضرور ہی تیرے علم میں ہوتی۔ اور جب تیرے علم

میں نہیں تو ظاہر ہے کہ واقع ہی نہیں ہوتی۔ تیرے علم کا مل و محیط کو میرے علم ناقص و محدود

سے نسبت ہی کیا ہے؟ اور ایک اسی پر کیا موقوف ہے۔ بخیر تو ہر غیب شن ہے۔ آئینہ ہے۔

امام رازیؒ نے خوب فرمایا۔ ہے کہ سوال کا جواب براہ راست دینے کے بجائے



اسے علم آہی پر مھولی کر دینا ادب و احترام کے تقاضے کے زیادہ مطابق ہے۔ اور یہ طور تعلیم و تکریم کا ہے۔ یہ خادم عرض کرتا ہے کہ مسیح کا یہ کلام عبادت و عبادت کا بھی شاہد عادل ہے۔ آپ یہ نہیں کہتے کہ میں تعلیم فلاں اور فلاں دے آیا تھا، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں تو وہی تعلیم دے آیا تھا جس کا تو نے حکم دیا تھا۔ اور یہ پیام بھی میری اپنی طرف سے : تھا، بلکہ یہ بھی میرے ہی ارشاد کی تعمیل تھی۔

قرآن آپ کے جواب کی مزید حکایت یوں بیان کرتا ہے :  
 مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَّا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ أَعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ  
 میں نے تو ان سے کچھ بھی نہیں کہا تھا سو اس کے جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا،  
 وہ بھی کہ عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔  
 یہ تو وہی قرآن مجید کی حکایت۔ لیکن خود انجیلوں میں اتنی تصحیف و تصرف کے بعد بھی تعلیم  
 لکھی چلی آتی ہے۔ چنانچہ انجیل متی میں ہے :

”یسوع نے اس سے کہا : ”اے شیطان دور ہو، کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند  
 اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔ تب ابلیس اس کے پاس سے  
 چلا گیا اور فرشتے آکر اس کی عبادت کرنے لگے (باب ۱۰ آیت ۱۱)  
 اور انجیل لوقا میں ہے :

”یسوع نے جواب میں اس سے کہا کہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر  
 اور صرف اسی کی عبادت کر“ (باب ۴، آیت ۸)  
 جواب مسیح ابھی ختم نہیں ہوا۔ چل رہا ہے :

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي  
 كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (آیت ۱۷)  
 میں اس پر آگاہ رہا، جب تک میں ان کے درمیان رہا۔ پھر جب تو نے مجھے



اٹھایا (جب سے) تو ہی ان پر نگراں ہے۔ اور تو تو گواہ ہر چیز پر ہے۔  
 غور کیجئے کلام میں، ایک بار پھر اپنی بندیت و شریعت کا اور حق تعالیٰ کے علم محیطہ  
 کامل کا اثبات ہے۔ کہتے ہیں کہ میں جب تک دنیا میں موجود رہا، اپنی اُمت کا مالی سرے  
 علم و مشاہدہ میں تھا۔ پھر تو نے مجھے دنیا سے اٹھالیا۔ اس کے بعد سے مجھے کیا خبر خبر  
 اس کا علم تو بس تجھی ہمہ وقتی نگراں کو رہ سکتا ہے۔ اور آگے چلئے:

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ إِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ  
 أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (آیت ۱۱۸)

تو اگر انہیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو انہیں بخش دے  
 تو بھی تو زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

عرض کرتے ہیں کہ تو مالک و مختار ہے، ہمہ توان و ہمہ توان ہے۔ تو جو چاہے ان کے ساتھ  
 معاملہ کر۔ اگر سزا کا معاملہ کرے تو میں تجھ میں اور تیرے بندوں کے درمیان دخل دینے والا  
 کون، اور اس کی مجھے کہاں مجال۔ اور اگر تو انہیں معاف ہی کر دینا چاہے تو کون تجھے  
 روک سکتا ہے۔ تو سب پر غالب اور تیرا ارادہ سب پر حاکم و مقتدر اور اسی کے ساتھ تو حکیم مطلق  
 بھی۔ تیرا کوئی بھی فیصلہ حکمت و مصلحت کو نبی کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ تو کرے گا تو وہی جو  
 عین آئین حکمت و مصلحت کے مطابق ہوگا۔

یاد کر لیجئے کہ ساری گفتگو دنیا میں نہیں، قیامت میں ہو رہی ہے، جب کوئی محل ہی شفا کا  
 کافروں اور منکروں کے حق میں باقی نہ رہے گا۔ ہیں سے یہ ہے کہ حضرت مسیح کے اس کلام میں  
 کوئی شاہد شفاعت و سفارش کا، باوجود ان کے پیروں جلیل القدر رہنے کے نہیں۔ بلکہ توفیق یا  
 پسردگی تمام تراش کی طرف ہے۔

اور ضمناً اس کے تردد پر بھی مسیحوں کے اس عقیدہ کی نکل آتی کہ قیامت میں عدالت کا  
 کام خدا کے نہیں، خدا کے بیٹے کے ہاتھ میں ہوگا۔ انجیل یوحنا میں ہے:



”باپ کسی کی بھی عدالت نہیں کرتا، بلکہ اس نے عدالت کا سارا کام بیٹے پر

رکھا ہے۔“ (باب ۱۳، آیت ۱۳)

ان سارے مکالمات و مخاطبات کے بعد قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمٌ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (آیت ۱۱۹)

اشر فرمائے گا آج وہ دن ہے، جب بچوں کے کام ان کا سچ آئے گا، ان کے لئے بارش ہوں گے جن کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی۔ اشران میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کر رہیں گے۔ اشران سے خوش رہا اور وہ اشر سے خوش ہے۔ یہی نیکو کامیابی ہے۔

صَادِقِينَ کا لفظ ابھی آپ نے سنا ہے۔ اس کا غنوم سمجھ لیجئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں عقیدہ صحیح اور عمل صالح پر قائم رہے۔ اس کے تحت میں انبیاء کے علاوہ اولیاء اور عام مومنین بھی داخل ہیں۔ عام مفسرین ادھر گئے ہیں کہ یہ اشارہ پوری آیت کے مضمون یعنی جنت اور خلود جنت اور رضوان الہی سب کی جانب ہے۔ لیکن امام رازی نے اپنی نکتہ سنجی سے یہ بات پیدا کی ہے کہ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ کا تعلق صرف نعمت رضوان الہی سے ہے جس کے سامنے جنت کی ساری نعمتیں سبچ ہیں۔ اور ان نعمتوں کو خلود ہی نہیں ابدیت بھی حاصل ہوگی۔

خالدین فیہا کے ساتھ اَبَدًا کی بشارت یہاں کی طرح اور بھی بار بار اہل جنت کے لئے آئی ہے اور اہل جہنم کے لئے اَبَدًا کی صراحت ایک ہی جگہ آئی ہے۔

— (پہلا ۵۴) —

جاہلی قوموں کی ذہنیت بھی ان کے عقائد کی طرح ایک خاص قسم کی ہوتی ہے قرآن مجید نے



کثرت سے مقامات پر ان کے اعتراض نقل کر کے اس کا پردہ بھی فاش کیا ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ (انعام، آیت ۸)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) کے اوپر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اُتارا گیا۔

کہنے والا مشرکین ہی کا کوئی گروہ تھا۔ رسول کا بشر محض ہونا ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا۔ ان کی سمجھ میں اُتارنا یا منظرِ خدا آجاتے تھے۔ یہ دیوتاؤں کے بلا تامل قائل تھے۔ خدا کے بیٹے بیٹیاں یقین کر سکتے تھے۔ یہ سب آسانی ان کے لئے قابل قبول تھا۔ لیکن بشر کی رسالت کو ان کے مانع کسی طرح قبول کرنے کو تیار نہ ہو سکے۔ برابر مطالبہ ان کی طرف کا اور بشریت کا، خرق عادت کا ہوتا رہتا۔ فرشتہ کا بھی تخیل ان کے یہاں نہ تھا۔ البتہ پیغمبر جب کہتے کہ فرشتہ میرے پاس پیام الہی لاتا تو اسے فرض کر کے یہ کہنے کو اچھا، اگر ایسا ہے تو فرشتہ کو لاؤ یعنی دکھاؤ۔ حالانکہ قائل جب بھی نہ ہوتے۔ بلکہ سخن پروری کی عادت سے مجبور ہو کر مانگ ہی کیے چلے جاتے۔

آگے جواب میں ارشاد ہوتا ہے :

وَلَوْ أُنْزِلْنَا مَلَكَ لَقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُونَ ۝ (آیت ۸)

حالانکہ اگر ہم فرشتہ اُتار دیتے تو قصہ ہی ختم تھا، پھر تو ان کو ذرا ہمت نہ ملتی۔

یعنی فرشتہ کا نزول دنیا میں اس طرح کہ وہ کافروں تک کو نظر آجائے یہ تو دستور الہی میں عین وقوعِ عذاب کے وقت ہوتا ہے، اس کے بعد ہمت کا امکان ہی کہاں ہے، عالمِ فہم اُردو میں یوں سمجھئے کہ ایسے کھلے ہوئے معجزہ کے بعد عالمِ ناسوت کے حجابات اٹھ جاتے ہیں اور غیبیت کے پردوں کے بجائے مواجہہ میدانِ شہود کا ہو جاتا ہے۔ عالمِ برزخ اسی کا دوسرا نام ہے، اور وہ عالم کشفِ حقائق کا محل ہے۔

اور کافروں کی اصل حقیقت معذب ہی ہونا ہے۔ اس لئے اس طاری شدہ عالمِ برزخ

کے وجود میں آتے ہی اس حقیقت کا ظہور اور سزا و عذاب کا ترتیب لازم ہو جاتا ہے۔



ثُمَّ لَا يُنْظَرُونَ ۝ آیت میں ثُمَّ اس اظہار شدت کے لئے ہے یعنی عذاب واقع تو ہو ہی گا، اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمت ذرا بھی نہ ملے گی۔

گویا عذاب کی شدت سے بھی بڑھ کر اس کا فوری وقوع ہے۔ — مزید یہ کہ:  
وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبَسُونَ ۝ (آیت ۹)

اور اگر ہم فرشتہ ہی کو تجویز کرتے تو اسے بھی آدمی ہی بنا کر بھیجتے اور ان پر ہم (پھر) وہی اشتباہ ڈالتے جس میں اب پڑے ہوئے ہیں۔

یعنی یہ لوگ اس انسانی صورت والے فرشتہ کے باب میں وہی احتمالات، وہی اشکالات، وہی کج بحثیاں پیدا کرتے، وہی کٹ ٹھٹھیاں نکالتے جو آج رسول اللہ سے متعلق نکالی رہے ہیں۔

مَلَكٌ يَأْتِيهِمْ فِي الْغَيْبِ ۝ اسے انسان نہ اپنے عام و معروف جو اس سے دیکھ سکتا ہے، نہ اس کے ملکات کے لحاظ سے اس کا اتباع کر سکتا ہے۔  
لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا: اسے بھی شکل و جسم کے لحاظ سے انسان ہی کی صنیں کا بنا کر بھیجتے تو تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ تو سکتے۔

لَلْبَسْنَا عَلَيْهِمْ ۝ یہ اشتباہ کا انتساب حق تعالیٰ کی بابت محض تکوینی حیثیت سے اور بطور مسبب الاسباب کے ہے۔ اس معنی میں اللہ سانپ کے زہر کا بھی خالق ہے، بیماری اور ہر دکھ درد کا بھی خالق ہے۔ بدی کا بھی خالق ہے۔ یہاں تک کہ شیطان کا بھی خالق ہے۔ اور ایمان، اسی کے ساتھ شن لیجیے، کہ نام ہے قلب کی ایک کیفیت اختیاری کا باقی کسی ایسے معجزہ کا سامنے آجانا، جس سے انسان بالکل بے اختیار و مجبور ہو جائے، جیسا کہ فرشتہ کو اس کی شکل پر دیکھ لینا، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ایمان اختیاری باقی ہی کہاں باقی ایمان تو معتبر جب ہی تک ہے جب تک ایمان بالغیب ہے جب تک کلمات و شہود و شروع



ہو گیا تو ایمان کا سوال ہی نہ رہا۔

### —: (۵۵) :—

یہ سورہ انعام چل رہی ہے اور اس کا بیشتر حصہ مسائل و احکام فقہی سے متعلق ہے  
تاہم دوسری قوموں کے عقائد و اعمال سے بھی جا بجا تعرض ہے۔ اہل کتاب کے متعلق ذکر ہے۔

الَّذِينَ اتَّيْنَاهُمْ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَ تِلْكَ لَكُمْ بِعُرْفُونِ  
أَبْنَاءَهُمْ (آیت ۲۰)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دے رکھا ہے وہ ان (صاحب) کو پہچانتے ہیں

ایسا ہی جیسے اپنے اپناے قوم کو پہچانتے ہیں۔

اس میں بناء اشکال لفظ آبناء ہم ہے۔ مفسرین و مترجمین کثرت اذہر گئے ہیں کہ  
اس سے مراد ان کے بیٹے اور صلیبی بیٹے ہیں۔ اور پھر اس اشکال کو حل کرنے کی ضمن میں طرح  
طرح کی توجیہات و تاویلات کی ہیں۔ حالانکہ آبناء ہم سے مراد اگر اپناے قوم لئے  
جائیں تو سرے سے کوئی اشکال ہی نہیں پیدا ہوتا، اور مطلب صاف نکلتا ہے کہ نبی خزانہ  
کی جو کھلی علامتیں ان کی کتب آسمانی، خصوصاً توریت میں دی ہوئی ہیں، ان کے لحاظ سے انھیں  
آپ کا پہچان لینا اور آپ کی تصدیق کرنا ایسا ہی آسان ہے جیسے خود اپنی قوم و نسل کے  
انبیاء، نسب یا بنی اسرائیل کی شناخت۔ یہاں ذکر اہل کتاب کا مجموعاً و مشترکاً ہو رہا ہے  
نہ کہ ان کے افراد کے لحاظ سے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۰ میں ایسے ہی لفظ آچکے ہیں، اور  
کسی پچھلے خطبہ میں بھی وہ آیت آپ کی سماعت میں آچکی ہے۔

### —: (۵۶) :—

قرآنی قصوں میں ایک اہم و مشہور قصہ رئیس الموحدين حضرت ابراہیمؑ کے



ایمان توحیدی کا ہے۔ آپ کے والد جن کا نام عربی میں سارح آیا ہے اور انگریزی میں تلفظ تیرہ (Terah) ہے اور فلسطین کا قدیم مسیحی مورخ یوسیبس (Eusebius) کے ہاں آشریا یا شریٹا ہے۔ قرآن مجید نے ان کا نام آذر بنایا ہے وہ بت پرست ہی نہ تھے بلکہ جیوش انساریکلو پیڈیا کی روایت کے مطابق بت ساز یا بت فروش بھی تھے (جلد ۱۲ - صفحہ ۱۰۷) اور آپ کا ملک کلدانیا یا بابل (موجودہ عراق) بت پرستی اور ستارہ پرستی کے دھرسے شرک میں مبتلا تھا تو انھیں ابراہیمؑ کی سرگزشت شران کی زبان سے سنئے:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آذَرَ اتَّخَذُ آصْنَامًا آلِهَةً ۖ إِنِّي أَخْلَصْتُكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (آیت ۷۴)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آذر سے کہا کہ تم بتوں کو سبود قرار دیتے ہو۔ میں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی رہوٹی گمراہی میں مبتلا پاتا ہوں۔

وَكَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ۝ (آیت ۷۵)

اور (اس لئے) ہم نے دکھا دی ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کی حکومت تاکہ وہ ہر جہاں کا ملکیقین کرنے والوں میں سے۔

چنانچہ وہ خود بخود کامل بھی ہو گئے، اور توحید کامل کے مبلغ بھی۔ یعنی زمین اور آسمان پر حق تعالیٰ کی حکومت قاہرہ کے مشاہدہ سے ان کے دل پر توحید کا نقش جم گیا اور از یاد معرفت سر نے انھیں مزید ایقان تک پہنچا دیا۔

مَلَکُوت سے مراد ہے وہ حکومت جو مخصوص ہے اللہ ہی کے لئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنی ربوبیت اور مالکیت کے طریقے ابراہیمؑ کے دل میں اُتار دیے۔ اور مشاہدہ



یا اِذَاعَتِ کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ مادی ہی آنکھوں سے ہو۔ چشم اعتبار یا بصیرت عقلی بھی مراد ہو سکتی ہے۔ اور ملکوت کی اضافت میں جو زمین کے حدود کے ساتھ سمادات یا آسمان بھی شامل کر لئے گئے، اس کی بلاغت اور زیادہ ہو جائے گی۔ جب یہ یاد کر لیا جائے کہ اہل کلمہ انہی زمینی ہی شرک (بت پرستی) کے نہیں بلکہ آسمانی شرک (ستارہ پرستی) کے بھی مجرم تھے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَا كَوْكَبًا قَالَ هَذَا رَبِّيَّ  
فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ۝ (آیت ۷۶)

اور جب رات ابراہیم پر چھا گئی تو انھوں نے ستارہ دیکھا۔ بولے یہی میرا پروردگار ہے۔ لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو بولے میں غروب ہو جانے والوں سے دل نہیں لگانا۔

اور نہ ایسوں کی الوہیت و عبودیت کا قائل ہو سکتا ہوں۔

ہرگز نہ سمجھئے کہ یہ سارا کمالہ جو چل رہا ہے، ایک ہی وقت میں ہوا چاند اور سورج کا شاہدہ ایک ساتھ ہو ہی کیسے سکتا ہے۔ یقیناً کل اجزے کے مختلف اجزاء مختلف اوقات میں ہوئے۔

کَوْكَبًا تو لفظی اعتبار سے کوئی بھی ستارہ ہو سکتا ہے، لیکن لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ وہ کوئی بہت ہی روشن ستارہ ہوگا۔ ماہرین فن کا بیان ہے کہ پرستش کے زیادہ ان دو ستاروں کی ہوئی ہے: ایک مشتری (Jupiter) دوسرا زہرہ (Venus) ساتھ ہی ہمارے مفسرین قدیم کی صفائے قلب دیکھئے کہ ان کے تسلیم سے تمام ان ہی دو ستاروں کے نکلے ہیں۔

خیر تو آپ نے کوئی روشن ستارہ دیکھا اور اپنی قوم پر حجت الزامی قائم کرنے کو انھیں دکھا کر کہا کہ یہی ہے ہمارا پروردگار یعنی تمہارے زعم و پندار میں۔ یہ طریق مخاطبت اُردو



فارسی، عربی، انگریزی ہر زبان میں عام ہے کہ مناظرہ کے وقت مخالفت کے قول کو اپنی زبان سے دہرا دیتے ہیں اور لب لہجے کے صافستہ علوم ہو جاتا ہے کہ مخاطب کا قول اور خیال نقل ہو رہا ہے بغیر اس کے کہ متکلم اس کی تصریح کرے۔ خود قرآن ہی میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ فرمائے گا اَیْنَ شُرَکَاؤِیْ ۚ اب کہاں ہیں میرے شریک ۚ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ تمہارے عقیدے کے مطابق میرے شریک۔ اور یہ مطلب کوئی اچھوت سے اچھوت بھی نہ لے گا کہ حق تعالیٰ اپنے شریکوں کا وجود تسلیم کر کے واقعی انہیں بلارہا ہے۔

لَا أُحِبُّ الْآفِلِیْنَ سے آپؐ نفی اُن کی مطلق معبودیت کی نہیں بلکہ محبوبیت کی بھی کر رہے ہیں۔ آپؐ فرما رہے ہیں کہ جو ہستیاں خود ہی غیر ثابت اور تغیر پذیر ہوں ان کے لئے جگہ مناسبے رول میں کسی عزت و وقعت کی کیسے ہو سکتی ہے ۚ عدم محبوبیت سیاق عبارت میں صاف عدم معبودیت کے مراد ہے

فَلَمَّا رَأَ الْقَمَرُ بَارِغًا قَالَ هَذَا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّیْنَ (آیت)  
پھر جب آپؐ نے دیکھا چاند کو چسپکنے ہوئے تو بولے یہ میرا پروردگار ہے  
لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو بولے کہ اگر مجھے میرا پروردگار نہ ہدایت کرنا  
دے تو میں بھی گمراہ لوگوں میں ہو جاؤں۔

لیکن اس کی ہدایت تو اول روز سے میرے شامل حال ہے اور اس لئے میں تو حید پر قائم ہوں۔ انبیاء کا یہ کمالِ عبدیت ہے کہ اپنے ہمنوا کمال کو اپنی جانب منسوب نہیں کرتے بلکہ اسے تمام تر عطیہ الہی سمجھتے اور کہتے ہیں۔ اور ستارہ پرستی کی طرح فخر پرستی تو جارہی قوموں میں عام رہی ہے۔

فَلَمَّا رَأَ الشَّمْسُ بَارِغَةً قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا أَكْبَرُ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يُقَوْمُ لِي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ (آیت ۷۸)



پھر جب آپ نے سورج کو چکنے جوئے دکھا تو بولے یہی میرا پروردگار ہے، پر سب  
بڑا ہے، لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو بولے اسے میری قوم والو! میں اس  
شرکے سے بری (بیزار) ہوں جو تم کرتے ہو۔

مِمَّا تَشْرِكُونَ میں یہ نہیں فرمایا، کہ جس شرک میں میں اب تک مبتلا تھا اس سے نکل  
آیا، بلکہ یہ فرمایا کہ وہ شرک جس میں قوم والے مبتلا ہیں۔

هَذَا أَكْبَرُ، آفتاب تو اجرام سماوی میں سب سے زیادہ بڑھا ہے، اور اہل کلدانیہ  
اس میں پیش پیش رہے ہیں۔

هَذَا دِجی آپ کی گفتگو میں یہ لفظ تین بار آیا ہے، اور وہ تینوں موقعوں پر آپ نے  
اپنے ہم قوم مشرکوں کی ترجمانی لفظ دَبّ ہی سے کی ہے، کہیں اللہ وغیرہ نہیں لائے  
ہیں۔ یہ اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ مشرک قوموں کو سب سے زیادہ ٹھوکر صفیٰ بوبیت  
ہی میں لگی ہے، اور یہی آج تک چلا آ رہا ہے۔ سورج دیوتا، چند رمان اور زہرہ مشتری کو  
خالق کوئی بھی نہیں کہتا۔ مشرک انھیں مخلوق مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس  
ہیں، ہماری مرادیں ان ہی سے وابستہ ہیں۔ ہماری دعائیں یہی سنتے ہیں، ہماری آرزوئیں  
یہی پوری کرتے ہیں۔ دَبّ کا لفظ ایسے موقع پر معنویت سے لبریز ہے۔

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلدِّينِ فَطَرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (آیت ۷۹)

میں نے اپنا رخ یکسو ہو کر اسی کی طرف کر لیا ہے، جس نے آسمانوں اور  
زمین کو پیدا کر دیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

وَحَاجَّتْهُ قَوْمُهُ ۖ قَالَ اتَّخَذْتَنِي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ۖ (آیت)

اور ان کی قوم لگی ان سے جھگڑنے، بولے کیا تم جھگڑا مجھ سے اللہ کے بارے  
میں کرتے ہو، دراصل ایک وہ مجھے ہدایت دے چکا ہے۔



حضرت نذیر اپنے دعویٰ پر دلیل بھی ساتھ ساتھ لائے ہیں۔ چنانچہ **لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** کہ کہہ فرما رہے ہیں کہ میں تو اس خدا کے واحد کا قائل ہوں جو تمہارے خود ساختہ زمینی اور آسمانی خداؤں، دیوتاؤں کا بھی خالق ہے۔

سارے مکالمہ میں آپ اسی کوئی بات زبان سے ادا نہیں فرماتے جس سے معلوم ہو کہ آپ پہلے مشرک تھے، اور اب پہلی بار مؤحد ہوئے ہیں۔ اور امام رازمی نے یہ نکتہ خوب لکھا ہے کہ **وَجَفَّتْ** کے ساتھ قاعدہ سنجوی کا مقتضایہ تھا کہ **وَجُرْهُیْ اِلَى الذِّخْرِ** لایا جانا، لیکن غیبتِ تنزیہ کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ **اِلٰی** لاکر کوئی شاہد یا سمت یا جہت یا دلیلی کریمٹ پیدا کیا جائے! اس لئے بجائے **اِلٰی** کے صرف **لَ** لے آیا گیا۔

اور یہ جو آپ نے اپنی قوم والوں سے مخاطبہ میں فرمایا کہ **اَتُحَاجُّوْنِیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰیْنِ** تو اس مقولہ کو سادہ طور پر نہیں بلکہ ذرا حسرت و استعجاب کے لہجہ میں ادا کیجئے، جب پورا مطلب واضح ہو گا یعنی اشتراکی شان! تم مجھ سے بحث و جدال کرنے چلے ہو تو حیدر کے مسئلہ میں جو مجھ پر بالکل کھل چکا ہے۔ اور مجھے ہدایت علم یقین کیا، عین یقین کے درجہ پر مل چکی ہے۔ **حَاجَّہٗ قَوْمُہٗ** کی سراحت سے کھل گیا کہ قوم والے بجائے اس کے کہ حضرت کی صدا سیدھی، فطری تعلیم کو مان لیتے، اُن سے بحث و جدال میں بڑگئے، اور گئے ان سے الٹی سیدھی کج بحثیاں کرنے۔ جیسا کہ ہر جاہلی مشرک قوم کا شیوہ ہے۔

————— ﴿ ۱۸۱ ﴾ —————

ہمارے رسول اور رسولِ اعظم کی آمد کے تذکرے پُرانے صحیفوں اور آسمانی نوشتوں میں جا بجا ملتے ہیں۔ قرآن نے اہل کتاب کو مخاطب کر کے ان کی نشان دہی بھی بار بار کر کے ان پر سخت قائم کی ہے۔ سورہ اعراف میں بھی یہ تذکرے ہیں۔ اور ایک جگہ تو بڑی وضاحت و تفصیل سے ارشاد ہوا ہے:



الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْنُوزًا  
عِنْدَهُمْ فِي الْتَوَارِثِ وَالْإِنْجِيلِ يَا مَرْهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ  
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ  
عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَاَلَّذِينَ  
آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ  
مَعَهُ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (آیت ۱۵۷)

جو لوگ پیروی کرتے ہیں اس رسولِ نبی کی جسے ان لوگوں نے لکھا ہوا پایا تو ریت  
اور انجیل میں وہ انھیں نیک کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں بُرے کاموں سے  
روکتا ہے، اور ان کے لئے پاکیزہ چیزیں بتاتا ہے، اور ان پر گندی چیزیں حرام  
دکھاتا ہے، اور ان پر سے بوجھ اور قیدیں جو ان پر اب تک تھیں، اُتار دیتا ہے۔  
سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور اس کا ساتھ دیا اور ان کی مدد کی اور اس نود  
کی پیروی کی جو اس کے ساتھ آتا رہا گیا۔ سو یہی لوگ تو ہیں پوری غلامی پانے والے

يَجِدُونَهُ مَكْنُوزًا : جسے لکھا ہوا پاتے ہیں، کے کھلے ہوئے معنی ہیں جن کی  
صفات و علامات وہ لکھی ہیں پاتے ہیں اپنے صحیفوں میں۔

الَّذِينَ سے مراد عام انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہاں مراد خصوصی ہے اہل کتاب  
سے۔ اور رسولِ اُمّی سے مراد بے پڑھا بھی ہو سکتا ہے (جیسا کہ آپ واقعہ تھے) اور  
اُمّ القریٰ والا بھی، اور اُمت رکھنے والا بھی۔

اور اصل ان سب باتوں کا ایک ہی ہے یعنی شخصیتِ محمدی۔ تو آپ کی بابت علامتیں  
توریت و انجیل سے تحریف و نصیف کے بعد بھی مدخل سکیں۔ توریت کے دو ایک حوالے آپ  
بھی سن لیں۔ صحیفہ استثناء باب ۱۸ کی چند رہیں آیت ہے:-

”خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا“



تم اس کی طرف کان دھریو۔“

”تیری مانند“ کا اطلاق اگر ہمارے رسول پر بھی نہ ہو گا تو اور کس پر ہو گا؟ اور پھر تیرے بھائیوں میں سے بنی اسمعیل و گربنی اسرائیل کے بھائی نہ تھے تو اور کون تھے۔  
دوسری آیت بھی اسی صحیفہ استثنائے ار کے اٹھارویں باب کی اٹھارویں آیت ہے۔  
”اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کیا سوا اچھا کیا، میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام ان کے منہ میں ڈالوں گا۔“

پھر وہی بھائیوں کا ذکر، اور اسرائیل کے بھائیوں، اسماعیلیوں میں سے، اور وہ بھی وہی لفظی کا دعویٰ سننے لگا اور کوئی دوسرا نبی آیا ہے؟

تیسری جگہ پھر اسی صحیفہ کے باب ۲۳ کی دوسری آیت ہے:

”خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران کے میدان میں وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔ اور اس کے داہنے ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی۔“

سینا سے اشارہ حضرت موسیٰ کی، اور سعیر سے اشارہ حضرت عیسیٰ کی جانب ہونا جس طرح ظاہر ہے، اسی طرح کلمہ کی پہاڑی فاران سے اشارہ حضرت محمدؐ کی جانب ہونا بالکل ظاہر ہے۔ آتشیں شریعت اسی رسول کی تھی۔ دس ہزار پاک نفس صحابہ کے ساتھ فتح مکہ کے وقت شہر میں خیمہ بھی ہمارے ہی رسول کا ہوا تھا۔

چوتھا حوالہ صحیفہ پیدائش کے باب ۱۱ کی اکیسویں آیت کا ہے:

”اور اسمعیل کے حق میں میں نے تیری سنی اور کچھ میں اسے برکت دوں گا، اور

اسے بڑا کر دوں گا، اور اسے بہت بڑھاؤں گا، اور اس سے بارہ سردار

پیدا ہوں گے، اور میں اسے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔“



حضرت اسماعیل کی نسل کے حق میں یہ سارے وعدے ہمارے رسول ہی کی ذات میں پورے ہوتے ہیں۔

صحیفہ پیدائش کا ایک اور حوالہ اس کے باب ۴۹ کی دسویں آیت کا:  
 ”یہوداہ سے ریاست کا حصہ جڈانہ ہوگا، اور نہ حاکم اس کے پاؤں کے دریا  
 سے جانا، ہے گا جب تک کہ سیلا اس کے پاس نہ آجائے اور قومیں اس کے پاس  
 اکٹھی ہوں گی۔“

دنیا کی مختلف قومیں ہمارے رسول ہی کے ظلم کے نیچے جمع ہوں گی اور سیلا کے معنی ہیں بھیجا جانے والا ہے۔ نیچے جانے والے وہی نبی تھے اور انھیں کے بعد سے یہود کا اقتدار مستایاں ظہور پر ختم ہوا۔

اسی طرح حضرت داؤد کے ایک نغمہ میں ہے:  
 ”میں ساری پشتوں کو تیرا نام یاد دلاؤں گا۔ بس سارے لوگ ابد آباد  
 تیری ستائش کریں گے۔“ (زبور - ۴۵ - ۱۷)  
 ایک اور حوالہ بھی اسی عہد عتیق کے صحیفہ یسعیاہ کا ہے:

”دیکھ میرا بندہ جسے میں سنبھالنا“ میرا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے،  
 میں نے رنج اس پر رکھی۔ وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرے گا۔ وہ  
 عدالت جاری کرے گا کہ دائم رہے اور اس کا زوال نہ ہوگا، اور نہ وہ جائے گا  
 جب تک کہ اسی کو زمین پر قائم نہ کرے گا، اور بھری مالک اس کی راہ میں (آیت ۴۲)  
 ”میرا بندہ“ اس عبارت میں صاف عہد کا ”دسولہ“ ہے، اور ”میرا برگزیدہ“  
 صاف ”مصطفیٰ“ ہے، اور جس کا ”زوال نہ ہوگا“ وہی تو ”خاتم النبیین“ ہے، اور انھیں  
 کی شریعت بھری مالک تک پھیل گئی

یہ سارے بیانات عہد عتیق کے تھے۔ اب انجیل کی بھی سنئے:



مسیحی کے باب ۲۱ کی آیات ۲۳ تا ۲۴ یہ ہیں۔

”یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معاروں نے رد کیا، وہی کوئے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظریں عجیب ہے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ مگر جس پر وہ گرے گا اسے وہ پیس ڈالے گا۔“

جس پتھر کو اسرائیلیوں نے ہمیشہ رد کیا تھا، وہ اٹھ اٹھی تھی۔ اور آخر میں اسی اسماعیلی نسل کے فرد کو نبوت ملی اور نبوت بھی اس شان کی کہ یہود و نصاریٰ جو بھی اس سے ٹکرائے چڑچوڑ ہو کر رہ گئے۔

آنجیل یوحنا میں حضرت مسیح کا بیان ہے کہ:

”وہ آدمی کہ جس کا میرے باپ نے وعدہ کیا ہے، اس کو تم پر نازل کروں گا۔ لیکن جب تک عالم بالا پر سے تم کو قوت کا لباس نہ ملے، اس شہر میں ٹھہرے ہو (باب ۱۴ آیت ۲۶)۔ جب تک ہمارے رسول کا نزول اجلال نہ ہو لیا، تقدس شہر یرושلم ہی کا قائم رہا۔ اور اس کے بعد کعبہ (واقع شہر مکہ) کی طرف منتقل ہوا۔“

اور آنجیل یوحنا میں ہے کہ جب حضرت یحییٰ کے ظہور کے بعد یرושلم سے کاہن اور آئے ان کے پاس یہ پوچھنے کے لئے کہ تو کون ہے تو سوالی وجواب کے بعد ان لوگوں نے کہا کہ:

”اگر تو نہ مسیح ہے، نہ ایلیاہ، نہ وہ نبی، تو پھر تیسرہ کیوں دیتا ہے؟“ (باب اولیٰ - آیت ۲۳)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہود مسیح کے علاوہ کسی اور نبی کے بھی منتظر تھے جسے وہ اپنی زبان میں ”وہ نبی“ کہتے تھے، یعنی قرآن کی زبان میں ”المنجی“۔



اور اسی انجیل یوحنا کے باب ۷ کی چالیسویں آیت ہے کہ :

”پس بھیڑ میں سے بعض نے یہ باتیں سن کر کہا کہ بے شک وہی وہ نبی ہے۔ اور وہ نے کہا یہ مسیح ہے۔“

یہ مزید ثبوت اس کا ہے کہ علاوہ مسیح کے ایک اور نبی موعود (النبی) کے آنے کا برابر انتظار ہو رہا تھا۔

اور اسی انجیل یوحنا کے باب ۱ کی سولہویں آیت میں خود حضرت مسیح کی زبان سے نقل ہوا ہے :-

”میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ دو سرا مددگار (یا شفیع یا کیل) بھیجے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔“

تو یہ ابد تک رہنے والا بجز خاتم النبیین کے اور کون ہو سکتا ہے ؟

انجیل یوحنا کے حوالے ابھی ختم نہیں ہوئے۔ اس کے باب ۱۵ کی چھبیسویں آیت<sup>۲۶</sup> میں حضرت مسیح کی زبان سے ہے :

”جب وہ مددگار (یا شفیع یا کیل) آجائے گا، جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح، جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے، تو وہ میری گواہی دے گا۔“

اور یہ ابد تک ساتھ رہنے والا اور حضرت مسیح کی تصدیق کرنے والا بجز ہمارے رسول اکرم کے اور کون ہو سکتا ہے ؟

اور یہ سارے انجیلی حوالے جو عرض ہوئے سب انھیں انجیلوں کے ہیں جو مسیحی کلیسا کو مسلم اور ان کے ہاں مستند ہیں۔ باقی مسیح کے حواری برنابا کی انجیل، جس کا ترجمہ عربی اور انگریزی دونوں میں اسی بیسویں صدی میں ہوا ہے، اسی میں کہیں زیادہ اور اشارہ کنایہ میں نہیں بلکہ صریح و واضح الفاظ میں ہمارے نبی کی آمد کی شہادت دے رہی ہے۔



اب قرآن کی آیت میں بوجھ اُتار دینے کی جو بات ہے تو وہ دوسرے لفظوں میں  
 یہی ہے کہ اس رسول کی شریعت تمام شریعتوں کی ناسخ اور ان پر حاکم ہوگی۔ اور وہ پھر  
 انھیں نیکی کا حکم دے گا، اور بدی و خباثت کی ہر راہ روکے گا۔ اس کی شریعت جامع و  
 کامل ہوگی۔ وہ سیاسیات، اجتماعیات، معاشرت و معیشت، اخلاق و تمدن سے ہر گز گئی کو  
 دور کرے گی۔ وہ عبادات و معاملات میں انفرادی و اجتماعی کاؤزی و روحانی ہر طرح پاکیزگی اور  
 ستمرائی کی راہیں کھولے گی۔ اور ہر شعبہ حیات کو نورانیت و لطافت سے بھر دے گی۔

### —: (۵۸) پینچ: —

اسی سورہ اعراف میں پیسروں اور خصوصاً سلسلہ موسوی کی بعض تفصیلات بیان  
 کرنے کے بعد ذکر کسی خاص شخصیت کا آیا ہے، جس نے دینی نعمتوں سے الالال ہونے  
 کے بعد بھی، راہ شقاوت و بد بختی اختیار کر لی۔

وَإِذْ عَلَّمْنَاهُ نَبَأَ الَّذِي أَتَيْنَاهُ إِلَيْنَا فَأَنْسَلْنَاهُ مِنْهَا  
 فَاتَّبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ (آیت ۱۷۵)

اور ان لوگوں کو اُس شخص کا حال پڑھ کر مٹائیے کہ اس کو ہم نے اپنی نشانیاں  
 دی تھیں، پھر وہ ان سے بالکل نکل گیا، سو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، اور  
 وہ گمراہوں میں ہو گیا۔

یہ شخص کون تھا، کہاں کا تھا، کس قوم اور زمانہ کا تھا، یہ کچھ تعین نہیں۔ اور جب قرآن  
 اس باب میں ساکت ہے، تو کسی شخص کی تعین پر جزم و اصرار بھی صحیح نہیں۔ ایک گروہ کا  
 خیال ہے کہ اشارہ رسول اللہ ہی کے ایک معاصر امیہ بن ابی اہصلت کی جانب ہے، اور دوسری  
 جماعت اکابر کا خیال ہے کہ اشارہ بنی اسرائیل کا ایک معلوم و معروف زائد، بلعم باعور کنعانی  
 کی جانب ہے۔ اس کا ذکر تورات کے صحیفہ گنتی کے باب ۲۲-۲۳-۲۴ میں تفصیل کے



ساتھ آیا ہے۔

بہر حال وہ صورت جب انسان اپنے ارادہ سے فسق اختیار کر لیتا ہے تو شیطان اس کے ساتھ مستقل رفاقت قائم کر لیتا ہے، گویا اس پر سوار ہو جاتا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَئِنَّكَ أَخْلَدْتَ إِلَى الْآدْنٰى  
وَأَتَّبَعَهُ هَوٰىءُ ۚ (آیت ۱۷۶)

اور ہم چاہتے تو اس کا مرتبہ ان نشانیوں کے ذریعہ اونچا کر دیتے لیکن وہ زمین کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کرنے لگا۔

”زمین کی طرف مائل ہو گیا“ یعنی اپنے قصد و اختیار سے دنیا کی پستیوں کی طرف جھک پڑا، اور یہ اس لئے ہوا کہ اُس نے عقیدہ و عمل کا معیار بجائے وحی الہی کے، اپنے نفس کو قرار دے لیا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا: یعنی اگر ہماری مشیت تکوینی یہی ہوتی کہ ہم بندہ کو بہر حال وہ صورت مجبور کر کے حسنِ عمل کی توفیق دیتے رہی رہتے تو بندے کے ارادے میں دخل دے کر اسے بہ جبر سیدھی راہ پر ڈال دیا کرتے۔ لیکن یہ قانون ہم نے اپنا رکھا ہی نہیں ہے۔

### بیچ (۵۹) بیچ: —————

سورہ انفال اگرچہ مجموعی حیثیت سے احکام کی سورہ خصوصاً احکامِ جہاد و مسائلِ قتال کی ہے۔ اس میں ایک موقع پر ایمان والوں کا تعارف کرایا گیا ہے اور ان کی شناخت تفصیل سے بیان کر دی گئی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ  
اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمُ الْاٰیٰتُ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَ عَلٰی  
دَیْنِهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (آیت ۲)



ایمان والے تو بس وہ ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے

تو ان کے دل سہم جاتے ہیں اور جب اس کی آئینیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو

ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر توکل رکھتے ہیں۔

پہلی چیز معلوم ہوئی کہ ان کے دل عظمت الہی کے استحضار سے سہم جاتے ہیں، اور یہی حاصل ہے تقویٰ کا۔

خود خدا وحییت الہی کی تاکید لکھے صحیفہ میں بھی ہے، چنانچہ یرسیاہ بنی کے صحیفہ کے پانچویں باب کی دوسری آیت ہے:

”خدا اور خدا ہے، کیا تم مجھ سے نہیں ڈرتے ہو؟ کیا تم میرے حضور میں نہیں

تھر تھراتے؟“

اور انجیل جو سب سے رحمت و شفقت کی سمجھی جاتی ہے، اس کے بھی صحیفہ مکاشفہ

پندرھویں باب کی چوتھی آیت میں ہے:

”اے خداوند! کون تجھ سے نہ ڈرے گا، اور کون میرے نام کی بڑائی نہ کرے گا؟“

کیونکہ میری تو ہی قوی ہے۔“

اور آیتیں سن کر ان کا ایمان بڑھنے لگتا ہے، قوت ایمان کی تازگی کے لحاظ سے — یہ بیان

ہوا مومنین کے صفائے قلب کا — — — لہٰذا وہ ہر حال میں اللہ پر توکل رکھتے ہیں، یہ

بیان ہوا ان کی علی حالت کا

کے مزید تشریح ارشاد ہوئی ہے :

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيَمْنَعُونَ مَالَهُمْ يُنْفِقُونَ ۝

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ كَرِيمٍ ۝

وَمَغْفِرَةٌ ۖ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝ (آیت ۳-۴)

اور یہ لوگ نماز کی پابندی رکھتے ہیں۔ اور ہم نے جو کچھ انھیں دے رکھا ہے



اس میں سے خرچ کرتے دہستے ہیں۔ یہی لوگ تو پتھے (اور پتے) مومن ہیں۔

ان کے لئے پروردگار کے پاس مغفرت ہی مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے۔

یعنی حقوق اللہ میں سے نماز اور انفاق، یعنی حقوق بدنی اور حقوق مالی، دونوں کی ادائیگی کا پورا اہتمام رکھتے ہیں اور محققین نے لکھا ہے کہ اعمال باطنی میں توکل اور اعمال ظاہری میں نماز و زکوٰۃ کے تصریحی ذکر سے اشارہ ہی نکلتا ہے کہ باطنی اور ظاہری زندہ گی میں یہی اعمال سب سے زیادہ اہم اور قابل اہتمام ہیں۔

ہمارے موجودہ دور کے لوگوں کے لئے یہ بھی قابل غور ہے کہ قرآن نے بہترین اعمال ظاہری و باطنی کہہ کر کیا چیزیں پیش کی تھیں، اور خود وہ، اپنے کن گڑھے ہوئے اعمال کو کمال زندگی اور کمال اسلام سمجھ رہے ہیں!

لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ، اور یہی نص ہے اس پر کہ جیسا کامل ان حضرات کا ایمان ہے، ویسے ہی جزا بھی انھیں کامل ہی ملے گی۔

===== (۶۰) =====

ایک ایسی جھلک لیکن بڑی پرمغز، معنی خیز، شرکین جاہلی کی عبادت کی بھی دیکھتے چلے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصَدِيَةً  
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ (آیت ۳۵)

اور ان کی نمازیں خانہ کعبہ کے پاس کیا تھیں؟ بجز سیٹی بجانے اور تالیاں بجانے کے۔ سو عذاب کا مزہ چکھو اپنے کفر کی پاداش میں۔

دوسرے اعمال جاہلی جیسے تھے، وہ تو خیر تھے ہی۔ ان کی نماز اور سب سے بڑی عبادت وہی کیا تھی، بجز خانہ کعبہ کے گرد ایک قسم کے ہود و لعب کی منہ سے سیٹیاں اور



ہاتھوں سے تالیاں !

خوب غور کر کے دیکھ لیا جائے کہ آج بھی جو غیر اسلامی اور جاہلی طریقے جاری و رائج ہیں، ان کا جزو و انضمام ہی باجا گا جا، تالیاں اور سیٹیاں، اور انھیں سے ملتی جلتی شکیں کھیل تماشہ کی ہیں یا نہیں؟ قرطبی وغیرہ فقہائے مشرین نے آیت کے تحت میں لکھا ہے کہ اس میں وعید ہے ان جاہل صوفیاء کے لئے جو بدو حال لا کر اچھلتے کودتے، تالیاں بجاتے اور ناچتے ہیں، اور اس کو کمال روحانی سمجھتے ہوئے ہیں۔

آیت کے آخری ٹکڑے میں شرکین کو جس عذاب کی وعید ہے وہ تو اس دنیا میں اس طعنے سے پوری ہو گئی، خارق عادت نہیں، موافق عادت الہی، غزوات و جہاد کے ذریعہ اور مشرکین کا قلع قمع چند ہی سال کے اندر ہو کر رہا۔

### — بیچ (۶۱) —

اسلام میں قتال اب شروع ہو گیا ہے اور ۱۳، ۱۴ سال کے پورے صبر و تحمل، اور ہر طرح کی نظرمیت چھیل لینے کے بعد اب اجازت پہلی بار مل رہی ہے قتال کی۔ بلکہ طریقہ اور مقصد بھی قتال کا بتایا جا رہا ہے۔ اہم ترین غزوہ، غزوہ بدر ہو اسے۔ اس میں مسلمانوں کو مال غنیمت بھی وصول ہوا۔ اس وقت اس مال کی تقسیم کے احکام بھی ذرا غور سے سن لیجئے:

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَ لِلرَّسُولِ  
وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَ الْبَيْنِ السَّبِيلِ إِن  
كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ وَ مَا أَنزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ  
يَوْمَ التَّفَاقُ الْجَمْعَيْنِ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (آیت)

اور جانے رہو کہ جو کچھ تمہیں بہ طور مال غنیمت حاصل ہوا ہے اس کا پانچواں حصہ  
اشر اور رسول کے لئے ہے، اور (رسول کے) قرابت داروں کے لئے اور یتیموں



کے لئے، اور مسکینوں کے لئے۔ اور اگر تم اللہ اور اس چیز پر ایمان رکھتے ہو جس کو ہم نے نازل کیا اپنے بندہ (محمد) پر فیصلہ کے دن دونوں جانتیں مقابل ہوں اور اللہ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

غنیمت کے لغوی معنی بہت وسیع ہیں۔ یعنی ہر اس چیز کے، جو انسان اپنی کوشش سے حاصل کرے۔ لیکن ایک محدود اور اصطلاحی معنی میں اس کا اطلاق صرف اس حال پر ہوتا ہے جو کافروں سے حالت جنگ میں بہ زور و قوت حاصل ہو۔ اس کا پہلا حصہ غازیوں میں تقسیم ہوگا اور ۱/۵ حصہ اللہ کی نذر ہوگا۔ یعنی آج کی بولی میں یہ حصہ اسلامی سٹیٹ ہوگا، اور اسلامی سرکاری خزانہ میں داخل ہوگا۔ فقہ حنفی کی کتابوں (ہدایہ وغیرہ) میں حرات کے ساتھ لکھا ہے کہ تقسیم میں یہ اللہ کا نام محض خیر و برکت کے لئے آیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کی پاک و ملک تو دنیا کا ہر مال ہے۔ اس کے بعد رسول کے حصہ کا جو ذکر ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ حصہ کوئی الگ نہیں۔ یعنی اللہ اور رسول کے دو حصے الگ الگ نہیں، بلکہ کل ایک ہی حصہ ہے۔ جو رسول کے زانہ لچپات میں ان کی خدمت میں پیش ہوتا تھا۔ نائب الہی اور خلیفہ اللہ کی خدمت میں اس کا پیش ہونا، اللہ ہی کے حضور میں پیش ہونا تھا۔ سرکاری ۱/۵ کا یہ پانچواں حصہ یعنی کل کا ۱/۴ حصہ خوب سمجھ لیجئے کہ اُس کو مل رہا ہے جو ایک ہی وقت میں آمر حکومت بھی تھا، اور امیر عسکر بھی اور حالی رسالت بھی!

وفات شریف کے بعد یہ حصہ بھی فقہ حنفی کے مطابق ساقط ہو گیا۔ اور خو و خلفائے راشدین کا طرز عمل فقہائے حنفیہ ہی کی تائید میں رہا، کہ انھوں نے رسول کا حصہ اپنی طرف منتقل نہیں کر دیا۔ دوسرا حصہ اقربائے رسول کا ہوا۔ (پہلا حصہ اللہ اور رسول کا ملا کر تو ایک ہی تھا) یہ جاں نثاروں کا وہ گروہ تھا، جس نے گمراہی سے لے کر مدینہ تک ہر حال میں ہر مصیبت میں ساتھ دیا تھا۔ اور فقہائے حنفیہ نے صراحت کر دی ہے کہ یہ حصہ نصرت محمدیم کی بنا پر تھا، نہ کہ عزیز واری کی بنا پر۔ ہدایہ میں صاف ہے: **ان المراد من النص قرب النصرة**



لا اقرب القرابة۔ بعد وفات نبویؐ، حصہ بھی ساقط ہو گیا۔ اس کے بعد اُمت کے مہتمموں کی کفالت و سرپرستی کا حصہ تیسرا حصہ ہوا۔ چوتھا حصہ اُمت کے مسکینوں یا ناداروں کا ہوا۔ وابن السبیل میں مسافروں کا حصہ شاید آج دنیا کی نظروں میں بہت کھٹکے لیکن اونچے ہوٹلوں میں ٹھہرنے والے، اور اونچے درجوں میں سفر کرنے والے، اور اعلیٰ موٹروں پر سفر کرنے والے، عام مسافروں کی حاجت مند کی اور مصیبت کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے، جنھیں پیدل یا گھوڑے، یا اونٹ کی سواری پر منزلوں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں، یا سردیوں کی کڑکھاتی ہوئی راتیں گزارنا پڑتی ہیں۔ اور جن ملکوں میں چھوٹ چھلت کا دور دورہ ہے، وہاں کے دیہات میں غریب پر دیسیوں پر کیا گزرتی رہتی ہے وہ اس کا تو اندازہ بھی نہیں کر سکتے

اس طرز تقسیم کو آج کی عینک سے بھی خوب غور کر کے دیکھ لیا جائے۔ سرکاری خزانہ کا دسواں حصہ ہی نہیں پورے کا پورا ۵/۱۰، دنیا کی کسی بڑی سے بڑی غریب نواز دھندہ عوام حکومت میں رعایا کے سب سے زیادہ مصیبت زدہ طبقوں (یعنی لاوارث مہتمموں) محتاج مسکینوں اور بے زاد راہ مسافروں پر دیسیوں کے لئے وقف ہے ؟ اور آیت میں جو تلمیح يوم الفرقان یا فیصلہ کے دن کی ہے، وہ معرکہ بدر کی جانب ہے، جب حق و باطل کے درمیان ٹکلی اور حسی فیصلہ سب سے مشاہدہ میں آ گیا، اور کفر و اسلام کے درمیان اسی پہلی اڑی ٹکرنے دنیا کی تاریخ میں ایک کامیاب انقلابی دعوت کی بنیاد قائم کر دی۔ یہ جنگ رمضان ۶۲۳ء عیسوی میں لڑی گئی اور مسلمان یعنی داعیان توحید اپنی بے سرد سامانی کے ساتھ کل ۳۱۳ کی تعداد میں تھے، اور مشرکین مکہ سواروں اور ہتھیار کے ساز و سامان کے ساتھ ۹۵۰ کی تعداد میں ....

اَنْزَلْنَاهُ (جو کچھ ہم نے اُنار) یعنی قوت غیبی۔ اور یہ ایجاز ہر تفصیل کا جامع ہے۔ عَلٰی عَجْدَنًا انہماں تشریف و تخصیص کے موقع پر رسول اللہ صلیم کا ذکر اس



عنوان سے کرنا، قرآن کریم کی بلاغت کا ایک خاص جزو ہے۔ آیت کے آخری جزو واللہ علیٰ کل شیء قدير میں افراد امت کو تنبیہ ہے کہ  $\frac{3}{4}$  جو تمہیں مل رہا ہے، اسے اپنی قوت بازو کا نتیجہ نہ سمجھو، اللہ جو ہر چیز پر قادر ہے، اسے اس کے فضل خاص کا نتیجہ سمجھو

### —: (۶۲) —:

اس حرب و ضرب والی سورۃ میں دو نکتے، چلتے چلاتے ایسے بیان کر دیے ہیں جو امت کے لئے دزم و بزم کی ہر کشمکش میں شعل ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔ پہلے نکتہ کا مخاطب براہ راست امت سے ہے، اور دوسرے کا، خود رسول سے پہلے پہلا نکتہ ملاحظہ ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا  
اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (آیت ۴۵)

اے ایمان والو جب تم سے کسی جماعت سے ٹکھیر ہو کر رہے، تو تم ثابت قدم رہا کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو تاکہ فلاح یاب رہو۔  
وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (آیت ۴۶)  
اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی، اور آپس میں جھگڑا مت کیا کرو ورنہ تم کم ہمت ہو جاؤ گے، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرتے رہو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یعین موقع قتال کا ہے۔ دشمن کی فوج سامنے کھڑی ہے۔ حکم یہ نہیں ہوتا، ہذب قوموں کی طرح کہ اپنی قوم کے فخر و فحندی کے گیت گائے، بلکہ یہ کہ اللہ کا ذکر کرو کہ قلب میں قوت ثبات اس سے ہوگی اور قدم بھی اسی سے جھٹھے رہیں گے۔ اور کوئی نزاع ہرگز



نہ پیدا ہونے دو نہ افرادِ امت کے درمیان نہ اپنے امیر لشکر یا قائد ملت سے، کبریہ اندرونی کشمکش، ڈپلن، (تظم یا اطاعت) کے حق میں نہ ہر قاتل ہے۔

فتفشلاً، انتشارِ قوت کا لازمی نتیجہ پست ہوتی ہے۔ اور دشمنوں پر جو غباری ایک دلی دیک جیتی کی بنا پر قائم ہوا ہے، وہ یقیناً جاتا رہے گا۔

وَأَصْبِرُوا یعنی جو ناخوشگوار و ناموافق حالات گرد و پیش میں پیدا ہوتے ہیں ان پر بہر حال صبر سے کام لیتے رہو۔ صبر محمود تو ہر حال میں ہے، موقعِ قتال پر اور زیادہ۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ: جزم اور قطعیت کے ساتھ فرما دیا گیا ہے کہ نیتِ حق خود ضامنِ نصرت ہے۔

دوسرا اصولی نکتہ اس سے بھی زیادہ اہم و ضروری اور زندگی کے انفرادی و اجتماعی دونوں شعبوں میں کام آنے والا، محض ضمناً، انگریزی محاورہ کے مطابق .... By The Way یا، راہ چلتے، یہ ارشاد ہو گیا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا يَافُسِيْهِمْ ۗ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (آیت ۵۳)  
یہ سب اس سبب سے کہ اللہ کسی نعمت کو جس کا انعام وہ کسی قوم پر کر چکا ہے، نہیں بدلتا، جب تک وہ لوگ اس کو بدل نہ دیں جو ان کے پاس ہے اور بیشک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

یعنی کوئی نعمت جو کسی قوم کو ملی چکی ہوتی ہے، وہ اس سے چھین نہیں لی جاتی جب تک وہ قوم اپنی حالت اُس سے مختلف نہ کر لے، جو نزولِ نعمت کے وقت تھی۔ اپنے اندر بجا ایمان و اطاعت کے کفر و نافرمانی اور خباثت نہ پیدا کر لے۔ نعمت اور خُبشت کا اجتماع نداشتِ حکمتِ الہی ہے۔ اس لئے پہلے خُبشت پیدا ہوئے گا، جب جا کر سلبِ نعمت ہوگا۔ اور نعمت کا مفہوم عام ہے۔ دنیوی، آخروی، انفرادی و ملی، مادی و روحانی سب ہی قسم کی



نعمتیں اس میں آجاتی ہیں۔ ہم آپ اگر اللہ کے بتائے ہوئے اسی ایک قانونِ تکوینی کے مفہوم کو اپنے دلوں میں اُتار لیں تو آج ہمارے کتنے بگڑے ہوئے کام بہن جائیں۔

—: (۶۳) —:

اتحادِ ملت کو ہم آپ چاہے کوئی معمولی درجہ کی چیز سمجھ رہے ہوں، لیکن کتابِ الہی کی نظر میں وہ اللہ کی ایک بہترین و افضل ترین نعمت ہے۔ اور اس کا ذکر ناکید خصوصی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِي آتَاكَ بِنُصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ ۚ وَاللَّهُ بَيْنَ  
قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ لَاقَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلْفَتْ بِينَ  
قُلُوبِهِمْ ۚ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ آیت (۶۳)

وہ وہی ہے جس نے آپ کو (اے رسول) اپنی نصرت سے اور مؤمنین کے ذریعے سے قوت دی اور ان کے دلوں میں اتحاد پیدا کر دیا۔ اگر آپ دنیا بھر کے مال خرچ کر ڈالتے تب بھی ان کے دلوں میں اتحاد نہ پیدا کر سکتے لیکن اللہ نے ان کے دلوں میں اتحاد پیدا کر دیا۔ بیشک وہ بڑا قدرت والا بڑا حکمت والا ہے۔

رسول کی ظاہری نصرت ظاہر ہے کہ مؤمنین ہی کے واسطے سے جوتی رہی۔ اور محض باطنی نصرت، نصرتِ غیبی کی کسی نہ کسی شکل سے۔ مثلاً کبھی نزولِ ملائکہ سے۔ اللہ کی کریمی اور کار سازی ہی تھی کہ اُس نے مؤمنین کے دل سے دوسری بخششیں، اور کردار میں شاکر سب کو اطاعتِ دین پر کجا متفق کر دیا۔ بغیر اس ایک جہتی کے نصرتِ دین ممکن ہی نہ تھی۔ اور رسول کو خطابِ خصوصی کر کے جو ارشاد ہوا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دنیا بھر میں سب کے بڑھ کر صاحبِ حکمت و صاحبِ تدبیر ہیں، آپ تاک سارے ممکن مالی ذرائع استعمال کر کے بھی نصرتِ اتحاد و اتفاق پر قادر نہ ہو سکتے۔ یہ تو محض فضلِ الہی کی کرشمہ سازی تھی۔ اللہ کی یہ نعمت کتنی اہم



عظیم ہے، یہ اس کلام سے ظاہر ہے۔

وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ وہ اپنی قدرت و قوت سے جو چاہے اور اپنی حکمت سے مناسب طریق پر چاہے کر دکھائے۔

—: (۶۱۲) —:

اب آپ سورہ برآۃ یا سورہ التوبہ پر آگئے، اور یہیں وہ آیت ملتی ہے جو منجملہ قرآن مجید کی اُن چند آیتوں کے ہے جو مستشرقین کے طعن کی ہمت ایک مدت دراز سے بنی چلی آ رہی ہیں۔ قرآن کے کلام الہی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ اسے جو کچھ کہنا ہوتا ہے اسے (جہ قول حضرت تھانوی) بے دھڑک کہہ دینا ہے بلا حاشا اس کے کہ سننے والے کیا رائے قائم کریں گے۔ وہ لاکھ کپڑے ڈالیں، نسخہ کریں، جہلی واقعہ، واقعہ ہی رہے گا، اور حقیقت آخر کار حقیقت ہی ثابت ہو کر رہے گی۔ قرآن مجید نے عقیدہ ابن التلبیت کا الزام جس طرح مسیحیوں پر لگایا ہے، اسی طرح یہودیوں پر بھی۔ اور مستشرقین کی طرح یہود اس سے بھڑک رہے ہیں اور کان پکڑ کر کہہ رہے ہیں کہ حاشا یہ ہم پر اٹھام ہے۔ ہم سدا کے موصد ہیں، اور ہم خدا کی بیوی بیٹا کیا جانیں۔

بات ذرا دیر میں صاف ہو گی اور حرم کے ثبوت اور پھر صفائی کی پیشی میں کچھ وقت لگے ہی گا۔ سامعین ذرا صبر و تحمل کے ساتھ سنیں۔

قرآن مجید کے الفاظ ہیں:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصْرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۚ ذَلِكَ قَوْلُهُمْ بِإِثْرَاهِمُ ۚ إِنَّمَا هُمُ قَوْلُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتِلْهُمْ اللَّهُ ۚ أَنَّى



## يُؤْتِكُون ۵ (آیت)

یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے فرزند (مجازی) ہیں، اور نصرانی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے فرزند (مجازی) ہیں۔ یہ ان کا قول ہے محض منہ سے نکل دینے کا۔ یہ انہیں لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے قبل کافر ہو چکے ہیں اور اللہ انہیں ہلاک کرے، کہ پھر بکے جا رہے ہیں۔

سب سے پہلے عزیر، عبرانی تلفظ میں عزرا کی شخصیت سے تعارف حاصل کر لیجئے۔ اسرائیل کے مذہبی دانشوروں میں ان کی شہرت کاتبِ توریت کی حیثیت سے ہے۔ یہ سال وفات غالباً ۵۲۵ ق۔ م۔ سخت نصر متوفی ۵۲۱ ق۔ م۔ تاجدارِ ایران و عراق نے جب یہود پر حملہ کر کے انہیں کامل طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ تو اسی سخت مصیبت کے عالم میں خود توریت کے نسخے بھی ان کے پاس سے محسوس ہو گئے۔ تقریباً ایک صدی اسی طرح گزر گئی۔ بالآخر انہیں عزیر بنجی نے توریت کو اپنی یادداشت سے دوبارہ ٹکھ دیا۔ اور اُسے یہود اس احسانِ عظیم کے بعد انہیں شیل ہوئی مانتے لگی۔ اور بعض نے غلو کر کے انہیں اس مرتبہ بھی بڑھا دیا

اب دوسری بات یہ غور سے سننے کی ہے کہ قرآن میں لفظ ابن اللہ آیا ہے ولد اللہ نہیں۔ اور عربی میں ابن اور ولد الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں جیسے اردو میں لڑکا اور بیٹا، یا انگریزی میں اور بائبل کے خاص محاورہ میں ایک Child of God دوسرا Son of God۔ ابن اللہ Child of God سے مراد صلیبی یا حقیقی فرزند نہیں ہوتا، بلکہ خدا کا فرزند معنوی، مجازی، یا لاڈلا یا پھیتا ہوتا ہے۔ قرآن ہی میں ایک دوسری جگہ اہل کتاب ہی کی زبان سے فقرہ نقل ہوا ہے۔ سَخْنُ آبْنَاءِ الْيَهُودِ آجْنَاءُ۔ یہاں ابناء کا عطف آجْنَاءُ پر ہے، اور کھلے ہوئے معنی فرزند مجازی یا لاڈلے چہیتے کے ہیں۔ یہود اس معنی میں حضرت عزیر کو مطاع کل اور محبوب خدا مانتے



اور ابن اللہ یا Child of God سے موسوم کرتے ہیں۔ مسیحیت کی دو بنیادی گمراہیاں الگ الگ ہیں۔ ایک شدید، دوسری آشد یا شدید تر۔ ایک حضرت مسیح کو اللہ کا ولد یا بیٹا Son of God ماننا، اس عقیدہ کا ذکر جہاں قرآن میں آیا ہے، بہت ہی سخت لہجہ کے ساتھ آیا ہے.....  
تَكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَّقَطُّونَ (قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے) وغیرہ۔

دوسری گمراہی ہے مسیح کو ابن اللہ Child of God قرار دینا۔ یہ گمراہی بھی اگرچہ سخت اور تھلک ہے، پھر بھی ولد اللہیت کا عقیدہ اس ابن اللہیت کے کہیں اسٹم ہے۔ یہود اس شرک جلی تک بے شک نہیں پہنچے۔ لیکن قرآن انہیں اس کا مجرم ہی کہتا ہے۔ البتہ ابن اللہیت میں کسی حد تک وہ مسیحیوں کے ہم سطح ہو گئے اس فرق و فتن کے نکتہ تک ہمارے بعض مفسرین پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ بحر المحیط میں یہ قول نقل ہوا ہے، اور ابن عطیہ کے حوالے سے تفسیر قرطبی میں بھی، کہ اس ابن اللہیت سے مراد نفسی و نفسی فرزند ہی نہیں، بلکہ محض لاڈ اور پیار والی فرزند ہی مراد ہے، اور خود یہ عقیدہ بھی کفر ہی ہے۔ یہ ابنیت والی گمراہی، یہود اور نصرا نیوں، دونوں میں مشترک ہے۔ اور نہ صرف انہیں دونوں میں، بلکہ یونان، مصر وغیرہ کی بہت سی قدیم و جاہلی قوموں میں۔

ذَٰلِكَ قَوْلُهُمْ يَا فَوَاحِشُهُمْ: محض ایک بکواس ہے۔ جو ان لوگوں نے بک ڈالی ہے، جسے حقیقت و واقعیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور یہ فقرہ کلام کو حرکت و زور دینے کے لئے لایا گیا ہے۔

يُضَاهِيُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ: یعنی اس جمل عقیدہ پر ان کے پاس تو کوئی دلیل ہے نہیں، نہ عقلی نہ دینی، یہ تو محض تقلید ہے، ان کافر قوموں کی جہاں پریشتر ہو چکی ہیں، اور خدا کی تجسیم کی قائل ہو کر عقیدہ حلول کی ماننے والی ہوئی ہیں۔ اشارہ خصوصی مشرکین یونان کی جانب ہے کہ انہیں کے فیلسوفوں کی خام خیالیوں کے



پہلی صدی مسیحی کے یہود و نصرانی دونوں متاثر بلکہ مرعوب ہو گئے۔ اور انھیں کے مشرک تعلیمات کو ہر اہم اپنے اپنے دین کا جزو بناتے چلے گئے۔ مسیحیت پر یونانی اور رومی مذہبوں کی گہرے چھاپ کی دریافت تو انیسویں صدی کے نصف آخر کے مغربی فاضلوں کاہلوں کی خصوصی تحقیقات بھی جاتی ہے۔ قرآن کے اس اعجاز کے قربان جائے کہ اس صدیوں قبل جب Higher criticism (تنقید عالیہ) کا کوئی نام بھی نہ جانتا تھا۔ ایک امی کی زبان سے دنیا کو اس حقیقت سے آشنا کر دیا۔ آخری ٹکڑے قَاتِلْهُمْ اللَّهُ اَنّی یُؤْفِکُوْنَ۔ پر حیرت زدہ نہ کیجئے۔ یہ تو عین فطرت بشری ہے کہ زبان پر ایسے فقرے پر سخت بیزاری، نفرت و غصہ کے الفاظ بے ساختہ آجاتے ہیں۔ جیسے یہی کہ "جدا غارت کرے" قرآن مجید نے ایسا فقرہ پڑھنے والے کی زبان سے ادا کر کے اُس کے جذبات کی عین ترجمانی کا حق گویا ادا کر دیا۔

### —:بخ (۶۵):—

اس سے ملتی ہوئی ایک اور گمراہی کا بیان قرآن مجید ہی کی زبان سے اسی سلسلہ میں سنتے چلے:

اِتَّخَذُواْ اَحْبَادَهُمْ وُرُثًا ثُمَّ اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ  
وَالْمَسِيحِ ابْنِ مَرْيَمَۃٍ وَمَا اُمُّرُوْاْ اِلَّا لِيَعْبُدُوْاْ اِلٰهًا  
وَاحِدًا لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَہٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (آیت ۳)  
ان لوگوں نے اشرک کے ہوتے ہوئے اپنے علماء اور اپنے مشائخ کو بھی اپنا  
پروردگار بنا رکھا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ انھیں حکم صرف یہ دیا  
گیا تھا کہ ایک ہی معبود (برحق) کی عبادت کریں۔ کوئی معبود نہیں اس کے  
سوا۔ وہ پاک ہے اس سے جو شرک یہ اس کے ساتھ کرتے ہیں۔



یعنی اہل کتاب نے اپنے علماء و مشائخ کو ایسا مستقلاً صاحب اختیار مان رکھا ہے کہ گویا وہ جو چاہیں جائز ٹھہرائیں اور جس چیز کو چاہیں حرام قرار دے دیں۔ سارے اختیارات شریعت و قانون سازی کے گویا انھیں کو حاصل۔ مسیحیوں کے ہاں آج بھی پوپ (پاپا کے روم) بحیثیت نائب مسیح یہ سارے اختیارات علانیہ رکھتا ہے اور پروٹسٹنٹ بھی عملاً سارے اختیارات چرچ (کلیسا) کو سپرد کئے ہوئے تھے، اور تالموود کی اب بھی جو اہمیت ہے، محتاج بیان نہیں

آیت کی تفسیر با ثور بھی یہی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں ہے کہ نو مسلم عدی بن حاتم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم اپنے مقتداؤں اور پیشواؤں کو خدا اکابر مانتے ہیں، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ حلال و حرام کے اختیارات ان میں مان لینا، انھیں خدائی ہی اختیارات دے دینا اور انھیں معبودیت کے مرتبہ پر پہنچا دینا ہے۔

آیت میں عوام مسلمانوں کے لئے بڑی غیرت موجود ہے۔ انھوں نے بھی مختلف اماموں اور مشائخ کو مستقل منطاع قرار دے کر عملاً انھیں معبودیت بلکہ خدائی کے مرتبہ پر پہنچا دیا ہے۔ قرآن کی روشن آیات کو اپنے ضمیر کی واضح شہادت کو کھلے ہوئے مشاہدہ کو سب چھوڑ دیں گے، لیکن اپنے شیخ کو کسی حالت میں نہ چھوڑیں گے۔ امام رازی نے یہاں پہنچ کر اپنے اُستاد کا قول نقل کیا ہے کہ میری نظر سے ایسے لوگ گزرے ہیں کہ جن کے سامنے میں نے ان کے مسلک کے خلاف قرآن کی آیتیں سنائیں، انھوں نے نہ تسلیم خم کیا، نہ انھیں قابل التفات خیالی کیا، بلکہ اُنہی حیرت سے میری طرف دیکھتے رہے کہ ان کے اسلاف کے خلاف یہ آیات قرآنی کیوں کر ہو سکتی ہیں۔ اور تاویل بجائے ان کے اقوال میں کرنے کے خود آیات قرآنی میں گرا پا رہے۔ امام صاحب اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ غور سے دیکھئے تو اکثر اہل دنیا اسی بیماری میں مبتلا نظر آئیں گے۔

تیسریت کی گرائیوں میں علاوہ انیسیت الہی و الوہیت الہی کے ایک بڑی گراہی



پتھی کہ مسیح کو مطاع مطلق سمجھتے۔ اور مطاع مطلق بھی بالکل اور براہ راست حق تعالیٰ کے مساوی اور ہم مرتبہ اور ان کی مطاعیت چونکہ یورپ اور کلیسا کی مطاعیت کے الگ اصلاً و مستقلاً تھی، اس لئے قرآن مجید نے اس کا ذکر بھی الگ کر کے کیا۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا؛ اور یہ توحید خالص کا حکم، شرک جلی و خفی کی ہر صورت سے الگ رہنے کا حکم، آج تک توریت و انجیل میں بے شمار تصرفات و تحریفات کے باوجود لکھا چلا آرہا ہے۔ مثلاً توریت میں کہ ”میرے حضور تیرا دوسرا خدا نہ ہووے۔“ دیکھیے صحیفہ خروج، باب ۲۔ آیت ۳۔ نیز صحیفہ استثناء باب ۵، آیت ۶ اور انجیل مرقس کے باب ۱۲۔ آیت ۲۹ میں ہے:

”سب حکموں میں اول کون سا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ، اول یہ ہے،

اے اسرائیل سن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔“

سُبْحَنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ اللہ کی ذات پاک و برتر ہے، نہ صرف جاہلی مشرکوں کے کھلے ہوئے اور اقبالی شرک سے، بلکہ اہل کتاب کے باریک بینی مختلف قسم کے شرکوں سے بھی۔

— (۶۶) —

سورۃ التوبہ کہنا چاہیے کہ قرآن مجید کی سب سے زیادہ جلالی سورہ ہے۔ احکامِ جاہ و قتال اور مشرکوں اور اہل کتاب، سب کے لئے وعیدوں سے لبریز۔ لیکن خاتمہ اس کا شانِ جمالی پر ہوتا ہے۔ اور جس نے خود اپنا نام دُؤن و رحیم رکھا ہے، اُس نے اپنے رسولِ صاحبِ جلال کو بھی یہاں اسی روپ میں پیش کیا ہے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ

حَرِصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ (توبہ، آیت ۱۲۹)



بیشک تمہارے پاس ایک سمیر آئے ہیں، تمہاری جنس میں سے۔ انہیں بہت گراں گزرتی ہے، جو چیز تمہیں مضرت پہنچاتی ہے۔ تمہاری بھلائی کے حریص ہیں۔ ایمان والوں کے حق میں بڑے شفیق ہیں، مہربان ہیں۔

پہلا سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ یہاں ”تم“ سے کون مراد ہے۔ اور ضمیر جمع مخاطب ”کم“ دونوں جگہ کس کے لئے ہے؟ بعض نے لکھا ہے کہ مراد اہل عرب ہیں کہ آپ انہیں کے درمیان بھیجے گئے تھے۔ لیکن قول محقق یہ ہے کہ خطاب ساری نوح انسان سے ہے۔ اور آپ کی بعثت تنہا عرب کی جانب نہیں، سارے عالم کی جانب تھی۔ کبیر اور روح المعانی دونوں میں یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ الخطاب للبشر علی الاطلاق۔ اور قرطبی نے یہ قول ایک مشہور امام لغت زجاج کی جانب منسوب کیا ہے۔ مشرک قوموں اور شرک مزاج گرد ہوں کی سمجھ ہی میں یہ نہیں آتا تھا کہ منصب رسالت پر کوئی بشر کیسے مامور ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر بار بار زور دینا اسی گمراہی کے رد میں ہے۔

عَزَّوَجَلَّ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ: آپ کے مزاج کی خصوصیت یہ تھی کہ جو چیزیں بشرت و مرتبہ انسانیت کو نقصان پہنچانے والی ہیں، وہ آپ کو سخت گراں گزرتی تھیں، اور آپ کے دل پر ان کا بار رہتا تھا۔ اور آپ کو انسانی ظلال و ہیود کا جیسے، ہو کار رہتا تھا۔ تو جب آپ کی شفقت ساری خلق اللہ کے لئے تھی، اور آپ کے دل میں درد نوح انسانی کے لئے تھا۔ تو خاص مومنین کے ساتھ آپ کے درجہ رافت و کرم، درجہ شفقت و تعلق قلب کے کون پاسکتا ہے؟

بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ: اسی درجہ تخصیص کے اظہار کے لئے ہے۔ رافت و رحمت تو خدا کی صفات والقباب ہیں۔ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ کا لقب آپ کے سوا اور مل کس کو سکتا تھا۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ



تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝ (آیت ۱۳)

اب بھی یہ لوگ اگر روگردانی کئے رہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ میرے لئے تو  
اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور  
وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

جب عرش الہی موجودات عالم میں سب عظیم تر ہے، تو جو اس کا مالک پروردگار  
ہے، اس کی ماتحتی اور ملک کابل میں سارے موجودات عالم کا ہونا بالکل ظاہر ہے۔ تو  
یہ لوگ اگر یہ سب کچھ جاننے کو بھٹنے کے بعد بھی انکار حق پر قائم رہیں، تو آپ کہہ دیجئے  
کہ میرا حافظ و ناصر تو مالک حقیقی ہے۔ مجھے تمہارے انکار و اعراض سے ضرر کیا، میرا تکیہ  
اسی ذات عظیم پر ہے، نہ کہ اپنے نفس پر یا کسی اور کی ذات پر۔

اور اسی پر اس سلسلہ معروضات کا اختتام ہے۔

خیال یہی تھا، اور یہی دلی تنازعہ تھا کہ کلام پاک کے جتنے مقامات مبیوس صدی عیسوی  
کے ایک طالب علم کی نگاہ میں قابل بحث نظر آئیں، اور جہاں جہاں اس کی نگاہ ٹھٹھکے  
اور قلب کچھ بھٹکے، سب ایک لڑی میں پرو کرنا ظہرین باتمکین اور سامعین صدر نشین کی  
خدمت میں پیش کر دیے جائیں اور اس کی برکت سے اشکالات کے حل مل جائیں اور  
شک و شبہ کی راہ کے کانٹے نکل جائیں۔ دلی رنج و قلق اور بڑی ہی گہری شرمندگی  
و حسرت کے ساتھ عرض ہے کہ مطالعہ پورے قرآن مجید کا کیا معنی، آدھے کا بھی  
نہ ہو سکا۔ اور ایہ مجاز و اختصار کی کوشش کے باوجود احاطہ صرف ایک تہائی یا ثلث  
قرآن کا ہو سکا۔

معذرت خواہی آپ ہی کے لطف و کرم سے ہے، اور عجب نہیں کہ ایک  
بندہ حقیر و نادان کی یہ محض طالب علمانہ کوشش آئندہ کے کسی فاضل و جید مفسر



کے لئے ٹٹھاتی ہوئی رشتی کا کام دے جائے۔ اور وہ اسی کی بنیاد پر ایک پرامنارہ نور  
قائم کر جائے۔

برادرانِ ملت! اب رخصتی کا سلام قبول فرمائیں۔ اور حشر میں جب ملاقات ہو  
تو ادھر سے معروضات کی تشنگی کا اعتراف ہو، اور ادھر سے آپ کی قدر افزائی کے  
الفاظ ہمت اور جوصلہ پیدا کر رہے ہوں، اور رحمتِ الہی اپنی بارش سے ہم کو، آپ کو  
سب کو ڈھانپ لے!

